آخری پودا
(منتخب افسانے)
رفعت صدیقی

آخری پودا

(منتخب افسانے)

رفعت صدیقی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

AAKHRI PODA
(Selected Storeis)
by
Rifat Siddiqi

Year of Editon 2011
ISBN 978-81-8223-804-6
Price Rs. 100/-

نام کتاب : آخری پودا (منتخب افسانے)
مصنف : رفعت صدیقی
پتہ : پریمیئر انکلیو، فلیٹ نمبر 103، B بلاک، ہمایوں نگر، حیدرآباد۔ 028 500
Mobile: 9885697408, L.L. 23535175
سن اشاعت : ۲۰۱۱ء
ڈاٹا پروسیس : سید نورالعارفین۔ ''نور'' ڈی ٹی پی سنٹر، ملک پیٹ۔ 9290487569
قیمت : ۱۰۰ روپے
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

میری شریک حیات

کے نام

فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

قارئین کی خدمت میں میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''آخری پودا'' پیش ہے اس مجموعہ میں شامل زیادہ تر افسانے، پچھلے چند برسوں میں تحریر کیے گئے ہیں اور ہندوستان کے مختلف معروف ادبی رسائل میں' شائع بھی ہو چکے ہیں۔ بعض ایسے افسانے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ جو میرے پہلے مجموعے میں موجود تھے۔ مقصد یہی ہے کہ جدید قارئین بھی انہیں پڑھ سکیں۔

ترقی پسند تحریک کے مدھم پڑ جانے کے بعد' جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دور میں، فکشن، بتدریج قاری سے محروم ہوتا گیا۔ گنجلک موضوعات' بے سمتی دوراز کار تشبیہی اور استعمارات، ناقابل فہم علامتی تھریک اور تجدیدیت فکشن پر غالب آ گئیں۔ نام نہاد نقادوں نے ایسی تخلیقات میں، نت نئی خوبیاں اور محاسن کا تذکرہ کرتے ہوئے صفحات سیاہ کر دیئے، تجدیدی فکشن نگاروں کے ساتھ، نقادوں کی ایک نئی کھیپ تیار ہوگئی۔ قاری نے فکشن پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک عرصے تک، ہمارا ادبی پیش منظر انتشار کا شکار رہا لیکن، پچھلے چند برسوں سے، اس ادبی رجحان میں صحت مند تبدیلیاں آئی ہیں۔ نئے قاری (گو انکی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے) پھر سے فکشن میں بیانیئے کو اہمیت دینے لگے ہیں اور افسانہ و ناول نگاروں نے بعض مستحسن ادبی تخلیقات پیش کی ہیں اور یہہ سلسلہ جاری ہے۔

میں، فکشن نگاری کے مستقبل' ہرگز مایوس نہیں ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ پچھلے تیس برسوں میں' ہمارے موضوعات بدل گئے ہوں Treatment کے معیارات میں بھی تبدیلی آئی ہو۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بے پناہ امکانات اور طرز ہائے زندگی میں زبردست انقلابات کے اثرات ہمارے اردو فکشن میں بھی نظر آنے لگے ہیں۔ روزگار اور بہتر معیار زندگی کی جستجو نے

بے شمار اشخاص کو ہندوستان سے نقل مقام کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ لیکن ، ہندوستان کا Diaspora ، بے پناہ خوش حالی اور معاشی آسودگی کے باوجود، اپنی جڑوں کو فراموش نہیں کرسکا ہے۔ اپنی تہذیب واقدار کے تحفظ کا جذبہ، ان پر غالب آتا جارہا ہے۔ اسی لیے وہ، کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو rejuvenate کرنے کیلئے، وطن کی مٹی کو چومنے کیلئے آہی جاتے ہیں۔

اس مجموعہ میں میرے کئی ایسے افسانے شامل ہیں۔ جن میں غیر مقیم ہندوستانیوں کے احساسات اور مسائل کا احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اگر میری تحریریں، کسی بھی قاری کے دل کو چھولیتی ہے تو میں یہہ سمجھوں گا کہ میری محنت چیز ہوگئی۔

رفعت صدیقی

پریمیئر انکلیو۔ فلیٹ نمبر 103

B بلاک، ہمایوں نگر، حیدرآباد۔ 028 500

فون: L.L. 23535175

Mobile : 9885697408

اجنبی

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ باہر سڑک پر کوئی اسکوٹر یا کار گزر جاتی تو سناٹے کے ٹھہرے ہوئے پانی میں تھوڑی سی ہلچل پیدا ہو جاتی تھی۔ کہیں دور، کوئی کتا وقفے وقفے سے بھونکتا جا رہا تھا۔

وہ اپنے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاس ہی رکھے میز سے ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی اس کے ہاتھوں میں کھلی ہوئی کتاب کے صفحات پر پڑ رہی تھی۔ بظاہر وہ عمر خیام کی رباعیوں کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا دھیان پڑھنے میں نہیں تھا۔ پاس کے کمرے سے اس کی بیوی کلثوم کے خراٹوں کی آواز مسلسل اس کے کانوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ کلثوم بڑی گہری نیند میں تھی گہری اور پر سکون۔

لیکن اسکی بوجھل آنکھوں سے نیند کہیں غائب ہو چکی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ جس گھر اور گھر کے افراد کے بارے میں سوچتے ہوئے پردیش میں راتوں کو جاگا کرتا تھا اب اسی گھر اور اپنے گھر والوں کے بیچ ہوتے ہوئے بھی نینداس سے کوسوں دور تھی۔

اس نے نظر اٹھا کر اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کی ساری آرائش، کلثوم کی ذاتی دلچسپی اور محنت کا نتیجہ تھی فرش پر دبیز قالین جس میں پاؤں ٹخنوں تک دھنس جائیں۔ ایک جانب مخمل کی Up holstery کے قیمتی صوفے۔ ان کے سامنے بڑے سے اسکرین والا سونی ٹیلی ویژن جس کے نیچے شیلف میں وی سی آر اور کتنے ہی ویڈیو اور آڈیو کیسٹ سلیقے سے رکھے گئے تھے۔ قریب کے مینٹل پیس (Mantel piece) پر بڑے ہی خوبصورت مصنوعی پھولوں کے گلدستے، ایک نفیس سا پن ہولڈر (Pen holder) اور کارڈ لیس فون۔ پاس ہی اس کی اور کلثوم کی ازدواجی زندگی کے آغاز کی ایک سنہری فریم میں سجی ہوئی فوٹو۔ دونوں کے چہرے مسکراتے ہوئے، جوانی کی سرشاریوں سے دمکتے ہوئے۔

اس نے ایک آہ بھر کر کتاب میز پر رکھ دی۔ وہ سرشاری، وہ سکون، وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں،

کے لئے اس نے کلثوم کے سارے زیورات فروخت کر دیئے تھے۔ کچھ لوگوں سے قرض بھی لیا تھا۔ سارا بوجھ اسے اتارنا ہی تھا۔ پھر وہ جی لگا کر نوکری کی ذمہ داریوں سے نمٹنے میں لگ جاتا۔ اس کا مالک اس سے بہت خوش تھا۔ آفس کے مقررہ اوقات کے علاوہ بھی وہ زیادہ کام کرنے سے نہیں جھجکتا تھا۔ اوور ٹائم کا معاوضہ' تنخواہ کے علاوہ مل جاتا تھا۔ وہ اپنے پیاروں کو چھوڑ کر روپے کمانے کے لئے ہی تو آیا تھا!

پہلی بار گھر واپس ہوا تو جیسے ساری کائنات میں بہار آ گئی تھی۔ کلثوم اور بچوں کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کے بچے اب بہتر اسکولوں میں پڑھنے لگے تھے۔ مکان کسی قدر سنور گیا تھا۔ دیدہ زیب پردے قالین' فریج' ٹی۔وی...... سبھی آسائش کے سامان آ گئے تھے۔ کلثوم جیسے بچھی جاتی تھی۔ شاید اس کی جانب سے اتنا پیار' اتنی محبت اسے شادی کے ابتدائی دنوں میں بھی نہیں ملا تھا۔ ایک مہینہ' پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اس کی روانگی کے دن پھر فضاء بوجھل تھی۔ جانا تو تھا ہی...... آنسوؤں سے بھیگا ہوا وہ رخصت ہو گیا۔

اسی طرح بیس برس بیت گئے تھے۔ وہ صحرا میں جی جان سے ریال کمانے میں لگ رہا۔ ہر برس کے ختم پر وہ صحرا سے اپنے گھر کے نخلستان میں آ جاتا جہاں اس کے پیارے بستے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے محسوس کیا کہ کلثوم کے سلوک میں تبدیلی آ رہی ہے۔ بچے بھی اب پہلے کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتے نہیں تھے۔ سبھی گھر والوں نے اب نئی نئی مصروفیتیں ڈھونڈ لی تھیں۔ ایسی مصروفیتیں جن میں وہ شامل نہیں تھا۔ شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اکرم کو پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے فریج سے بوتل نکالی اور ایک گلاس میں پانی انڈیل کر پینے لگا۔ پیاس تو بجھ گئی لیکن اس پیاس کا کیا ہوگا جو اس کے جسم و جاں میں لاوا بن کر ابلنے کے لئے بے تاب تھی! شاید اس پیاس کا احساس اب کلثوم کو بھی نہیں رہا تھا یا شاید وہ محسوس کرتے ہوئے بھی انجان تھی۔ اس کی نظر سوتی ہوئی کلثوم پر پڑی۔ کیا یہ وہی کلثوم ہے؟ پرانی کلثوم؟ شاید ہے بھی۔ اور نہیں بھی! خوشحالی اور عمر نے اس کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھا دی تھیں۔ چہرے کے دلکش نقوش' گوشت کے انبار میں کہیں کھو گئے تھے۔ اب وہ سوتے وقت معمولی سوتی ساڑیاں نہیں پہنا کرتی بلکہ سلک کی قیمتی ساڑیاں اس کے جسم کی زینت بنی رہتیں۔ آخر وہ پرانی کلثوم کہاں کھو گئی؟

اس کا جی چاہا کہ کلثوم کو چھو کر جگا دے اور اس سے کہے کہ میں ...... تمہارا شوہر' کل تمھیں پھر ایک بار چھوڑ کر ایک برس کے بن باس کے لئے جا رہا ہوں۔ آگے کئی راتیں فراق کی تاریکی میں ڈوبی ہوں گی۔ آج کی رات صرف آج کی رات تم میرے ساتھ جاگ نہیں سکتیں؟ تمھارے ساتھ کتنا وقت گزارنا تھا! کتنی باتیں کرنی تھیں لیکن سب دل ہی میں رہ گئیں۔

وہ پلنگ کی جانب کسی قدر بڑھا بھی ...... لیکن پھر وہ رک گیا۔ اسے کلثوم کے سونے سے پہلے ڈرائنگ روم میں اس سے کی ہوئی گفتگو یاد آ گئی۔ جس گفتگو میں اس کے دونوں بیٹے بھی بعد میں شریک ہو گئے تھے۔

اکرم نے' دس دن پہلے کہی ہوئی بات دہرائی تھی کہ شاید' وہ آخری بار' وطن چھوڑ کر جا رہا ہے۔ آئندہ برس شاید وہ ہمیشہ کے لئے نوکری چھوڑ کر اپنے وطن واپس ہو جائے گا۔

یہ بات سن کر کلثوم جیسے بپھر گئی تھی۔ اس نے کہا'' آپ بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ابھی لڑکے پڑھ رہے ہیں۔ اسلم' ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے فائنل ایئر میں ہے اور مکرم انجینئرنگ کر رہا ہے۔ ان دونوں کو Settle ہونے میں ابھی کئی برس لگ جائیں گے۔ تب تک ہمارے خرچ کا کیا ہوگا......؟

اکرم اس کے لہجے کی شدت سے سہم سا گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا'' دیکھو اب تک میں جو کچھ کما چکا ہوں وہ ہماری آئندہ زندگی خوشگوار گزارنے کیلئے کافی ہے۔ خدا کے فضل سے یہ عالشان بنگلہ ہے۔ کار ہے۔ بینک بیلنس ہے۔ آسائش کی سبھی چیزیں ہیں۔ شہر سے دور میں نے جو ایک فارم ہاؤس خریدا ہے اسے فروخت کر کے میں' یہاں واپس آنے کے بعد کوئی اچھا سا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں۔ میں باہر نوکری کرتے کرتے اب تھک چکا ہوں۔ اب میں اپنی مرضی سے کوئی کام کرنا چاہتا ہوں اور پھر میری صحت......؟

'' آپ کی صحت؟'' کلثوم نے اس کی بات کاٹ دی'' آپ کی صحت کو کیا ہوا؟ بلڈ پریشر کوئی جان لیوا بیماری نہیں ہے۔ اور پھر آپ یہاں لوٹ کر کیا کریں گے؟ کبھی پہلے تو بزنس کیا نہیں۔ بزنس شروع کریں گے تو پہلے جو کچھ کمایا ہے وہ بھی گنوا دیں گے اور کیا......''

تب مکرم' اس کے نورِ نظر نے کہا'' ڈیڈی! ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ کی طبعیت بزنس کے لئے قطعی موزوں نہیں ہے۔ آپ کے لئے باہر کا جاب (job) ہی ٹھیک ہے۔''

''اچھا! تو اب آپ بھی بولنے لگے؟'' اکرم کو غصہ آ گیا'' چالیس ہزار کا ڈونیشن دے کر انجینئرنگ میں صاحبزادے کو داخلہ دلایا اور آپ ہیں کہ دو برس سے لگاتار فیل ہو رہے ہیں اور اس پر آپ مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟''

'' آپ بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے'' کلثوم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا'' وہ پڑھائی میں لگے ہوئے تو ہیں۔ آج نہیں تو کل اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو جائیں گے۔ لیکن آپ' سعودی عرب سے اپنی واپسی کا خیال خدا کیلئے چھوڑ دیں۔ ورنہ حالات کو بگڑتے دیر نہیں لگے گی۔''

اکرم یہ سن کر کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ یقیناً کلثوم اور ان لڑکوں کے حساب سے حالات بگڑ ہی جائیں گے۔ یہ جو کلثوم ہر ہفتے ایک نئی ساڑی خریدتی ہے۔ سال میں کئی بار نئے زیور لئے جاتے ہیں۔ پھر ہر پارٹی یا تقریب کے موقع پر بیوٹی پارلرس (Beauty Parlours) کے پھیرے جو ہوتے ہیں! ہر دوسرے یا تیسرے دن' سہیلیوں کے ساتھ کسی نہ کسی کے مکان پر۔ کٹی پارٹیز (Kitty Parties) جو ہوتی ہیں۔ پھر طرح طرح کی شاپنگ۔ لڑکے بھی اپنی اپنی سواریوں پر اپنے ان گنت دوستوں کے ساتھ سارے شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔ جب بھی وہ انہیں ٹوکتا تو کلثوم ان کا بچاؤ کرنے کے لئے آگے آ جاتی۔ اسے حیدرآباد آئے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ چند ہی بار وہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے ملنے کے لئے باہر جا سکا تھا۔ زیادہ تر مکان پر رہتا۔ رسائل یا اخبار پڑھتا یا ٹی۔ وی دیکھتا رہتا۔ کلثوم زیادہ تر یا تو شاپنگ کے لئے چلی جاتی یا کسی سہیلی کے ہاں کسی تقریب یا پارٹی میں شریک رہتی۔ گھر پر رہتی بھی تو کسی اور کمرے میں۔ اس کے لئے بے شمار فون کالس بھی نہ جانے کہاں کہاں سے آیا کرتے اور وہ گھنٹوں ٹیلی فون پر باتوں میں مشغول رہتی۔ بے پناہ خوشحالی نے ان گنت دوستوں کے لئے راستہ بنا دیا تھا۔ اسے حسرت رہ گئی کہ کبھی کلثوم یا لڑکے تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ گزار لیں۔ اپنی سنائیں اور اس کی سنیں۔ اب کلثوم کے ساتھ تنہائی میں بھی کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی کلثوم ہے؟ بھولی بھالی' معصوم اور محبت اور خود سپردگی کا پیکر! نہیں۔ یہ تو کوئی اور ہی عورت ہے! تیز و طرار' منہ پھٹ اور خودغرض۔ کیا اپنی زندگی کے بہترین برسوں کی محنت کا یہی صلہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں اجنبی بن کر رہ جائے؟ ہاں! وہ اب اجنبی ہی تو

تھا۔اب اس گھر میں اس کا کوئی اپنا نہیں رہتا۔کوئی بھی نہیں! سب اسے محض روپیہ ڈھالنے والی مشین سمجھنے لگے ہیں۔صرف ایک مشین جس کا کوئی دل نہیں ہوتا! احساسات نہیں ہوتے۔اس کی رگوں میں اب خون نہیں دوڑتا! اب وہ ان سب کے لئے ایک بے جان شئے بن کر رہ گیا تھا۔

گلاس' میز پر رکھ کر وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔اب اس گھر میں اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں رہی۔اب اس کا ہر سال گھر لوٹ کر آنا کسی کے لئے بھی خوشی کا باعث نہیں اور نہ ہی اس کا واپس چلا جانا ہی کسی کے لئے رنجیدگی کا سبب۔اب اس کے لئے کسی کے بھی دل میں کوئی جذبہ نہیں۔وہ بڑا بے وقوف ہے کہ پردیش میں ہر دن' اپنے گھر والوں کو یاد کر کے تڑپتا رہتا ہے۔اس کے آنے یا نہ آنے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ کچھ بھی تو نہیں! ہاں! اس کے بھیجے ہوئے روپوں کا انتظار سبھی کو رہتا ہے۔پھر وہ یہاں آئے ہی کیوں؟ اب وہ صرف روپے ہی بھیجا کرے گا۔ہر سال کی طرح گھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔شاید کئی برس تک بھی نہیں۔اب وہ ایک مکمل اجنبی بن چکا ہے!

اس کے دل کو اچانک سکون سا محسوس ہوا۔وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا جو اسے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔

اس نے کمرے کی بتی بجھا دی۔صبح ساڑھے چھ بجے اسے بمبئی کی فلائٹ پکڑنی تھی۔اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں!

☆☆☆

اپنا ہی ماتم

ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی ایک پرسکون سیٹ پر میں' گزرتے ہوئے مناظر کا بدلتا ہوا منظر نامہ دیکھنے میں محو تھا۔ زندگی کا سفر ٹرین کے سفر سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ وہی بدلتے ہوئے مناظر' منزل تک پہنچنے کی جستجو۔ اور انتظار...... بدلتے ہوئے ہم سفر۔ جو پہلے پہل اجنبی ہوتے ہیں' پھر چھوٹی چھوٹی باتیں قریب لے آتی ہیں۔ ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی شدید خواہش...... پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ چند لمحوں کی ملاقات' بعد میں' ایک طویل رفاقت میں بھی بدل جاتی ہے!

طویل رفاقت؟ مگر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا کہ اتنی طویل شادی شدہ زندگی بھی ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ لا سکی؟ جسمانی قربت تو چند ہی برسوں تک رہ سکتی ہے لیکن ذہنی یگانگت تو عمر کے ساتھ بڑھنی ہی چاہیے پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور اولاد؟ جن کی پرورش میں انسان اپنی زندگی کا بہترین حصہ صرف کر دیتا ہے' وہ' اپنے ماں باپ کی امیدوں پر پوری کیوں نہیں اترتی ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم جب ان کی آرزوؤں کا خیال رکھتے ہیں تو وہ بھی ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

ایک طویل عرصے تک ایک مغربی ملک میں' وہاں کی طرز زندگی کے مطابق' اپنی بیوی اور بچوں کے لئے تمام آسائشیں مہیا کرتے رہنے کے بعد اب مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا استحصال کیا گیا ہے؟

پچھلے دس برسوں سے' میں حیدر آباد' ایک بار کے لئے بھی نہ آ سکا حالانکہ یہیں میری کالج کی تعلیم ہوئی تھی۔ یہیں شادی کے بعد کئی برس تک میں امریکہ جانے کیلئے تگ و دو کرتا رہا اور جب وہاں چلا گیا تو وہاں کی تیز رفتار زندگی نے جیسے ہمیں ہڑپ لیا۔ کب مہینے' برسوں میں بدل جاتے' معلوم ہی نہ ہوتا۔ کئی برسوں کے بعد' جب حیدر آباد آنا ہوا تو اس چھوٹے سے شہر کی بھی یاد آئی جہاں بچپن گزرا تھا۔ جہاں والد' مدفون تھے۔ لیکن اس شہر کو جانے کا وقت ہی نہ ملا۔

اب کی بار یہ تہیہ کر کے آیا تھا کہ وہاں ضرور جاؤں گا۔ ان در و دیوار کو چھوآؤں گا جن کے چپے چپے سے اٹھتی ہوئی خوشبو نے مجھے ہمیشہ آنے کی دعوت دی ہے۔ حیدرآباد سے دو سو کیلو میٹر کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ بیوی سے پوچھا تو وہ انجان ہوگئیں۔ بچوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہمارے لئے حیدرآباد ہی میں دن کاٹنا مشکل ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں 'بور ہونا' کون پسند کرے گا؟ لہٰذا میں نے اپنی کتھارسس (Catharsis) کی سوچ کر بیوی اور بچوں کو ان کے اپنے شب و روز کے حوالے کیا اور سفر کی ٹھان لی۔

ٹرین کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ منزل قریب آرہی ہے۔ آخر ٹرین رک گئی۔ میں نے اپنا بریف کیس تھاما اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ سامنے، کبھی دو کمروں والا ریلوے اسٹیشن ہوا کرتا تھا اب وہاں ایک اونچی عمارت کھڑی تھی۔ بڑی مشکل سے بھیڑ کے بہاؤ کے تھپیڑے کھاتے ہوئے میں باہر آیا۔ جہاں تانگے اور رکشا ہی نظر آیا کرتے تھے۔ وہاں اب 'بسوں' کاروں' آٹو اور اسکوٹروں کی بہتات تھی۔ مجھے اس شہر میں' بس چند ہی گھنٹے گزارنے تھے۔ اس لئے' میں نے ایک قریبی ہوٹل کا رخ کیا۔ ایک خالی میز پر بیٹھ کر میں نے نظر دوڑائی تو کاؤنٹر کے پیچھے ایرانی سیٹھ کا چہرہ نظر آیا۔ بیرا آیا تو میں نے اسے چائے اور بسکٹ کا آرڈر دیا۔

ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے ایک ڈرائیور سے اس محلے کو چلنے کیلئے کہا جہاں کبھی میرا' آبائی مکان ہوا کرتا تھا۔ کئی سڑکوں سے گزرنے کے بعد اس نے ایک چھوٹی سی سڑک پر آٹو روک دیا اور مجھ سے اس نے کہا "صاحب! یہی محلہ ہے!" میں نے نظر دوڑائی تو وہاں سارے پکے مکان اور وہ بھی زیادہ تر' دو منزلہ نظر آئے۔ میں آٹو سے اتر کر بریف کیس ہاتھ میں تھامے دیکھتا رہا۔ میرا وہ بڑے بڑے دالانوں اور جامن کے پیڑوں سے بھرا مکان کہاں گیا؟ چچا فیض الدین کا باغ کدھر ہے؟ لڈو میاں کی وہ چھوٹی سی دوکان کہاں غائب ہوگئی؟ وہ سب لوگ کیا ہوئے؟ میرا بچپن کہاں گیا؟

تھوڑی ہی دیر میں' میں پھر سے آٹو میں بیٹھ چکا تھا۔ اب مجھے اس قبرستان کی جانب جانا تھا جہاں میرے باپ دادا مدفون تھے۔

آٹو تھوڑی ہی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ لیکن میں آٹو سے اتر کر حیران رہ گیا۔ میرے بچپن میں یہ قبرستان شہر کے آخری سرے پر ہوا کرتا تھا لیکن اب ایسا لگتا تھا جیسے یہ کسی چورہے کے بیچ

واقع ہے۔ اب اس قبرستان کو ایک ٹوٹی ہوئی کمپاؤنڈ وال نے گھیرا ہوا تھا۔ اس کی بوسیدہ پھاٹک کھول کر میں داخل ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مردہ افراد تو کیا' یہاں زندہ افراد بھی نہیں آیا کرتے ہیں۔ امریکہ میں کسی قبرستان پر نظر ڈالیں تو فوراً دفن ہو جانے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ مگر یہاں...... خیر...... میں آگے بڑھتا گیا اور میرے والد اور دادا کی قبروں کی تلاش کرتا رہا۔ زیادہ تر قبریں ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ کسی کے کتبے' اکھڑے ہوئے تھے اور کسی کے پتھر۔ میں نے ہر قبر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ان دونوں قبروں پر کتبے لگے ہوئے تھے۔ شاید ادھر ہوں۔ یا شاید ادھر۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ بڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں سارے قبرستان کا چکر لگا چکا ہوں۔ سب ایک جیسی ہی لگ رہی تھیں یا خدا! میں ان دو قبروں کو کیسے ڈھونڈھ سکوں گا؟ اب دھوپ کی شدت بھی بڑھ چکی تھی۔ میرے ہر مسام سے پسینے کی دھار بہہ رہی تھی۔ باہر ٹریفک کا شور قبرستان کے سناٹے پر غالب تھا۔ طرح طرح کی گاڑیوں کے بے ہنگم اور کان پھاڑ دینے والے ہارن۔ یہ ہندوستان میں ہارن اتنے زیادہ کیوں بجائے جاتے ہیں؟ کہیں' اس ہارن بجانے کے پیچھے عدم سلامتی کا احساس تو نہیں؟

تھک کر' قبرستان کے ایک گوشے میں' ایک پتھر پر میں بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔ یہ کیسی بے بسی ہے کہ اتنے برسوں سے ان قبروں کے دیدار کی خواہش نے مجھے بے تاب کر رکھا تھا اور اب جب کہ میں ان سے اتنا قریب ہوں میں انہیں دیکھ نہیں سکتا! شاید یہ میرے مقدر ہی میں نہیں ہے!

تبھی قریب کی جھاڑی سے کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا اڑا اور میں چونک گیا۔ میری نظر قریب کے ایک اکھڑے ہوئے کتبے پر پڑی جس کا نچلا حصہ ٹوٹ پھوٹ کر مٹی میں مل چکا تھا۔ یہ کیا؟ کتبے پر تو میرا نام لکھا تھا۔ ''اسرار احمد''۔ نیچے' ہی تاریخ وفات بھی لکھی تھی جو پڑھی نہ جا سکی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس ٹوٹے ہوئے کتبے کو اٹھا لیا۔ ہاتھوں سے اس پر جمی ہوئی مٹی جھاڑی اور پھر اسے' اسی قبر پر رکھ دیا۔

پھر' میں نے اپنی ہی قبر پر فاتحہ پڑھی اور قبرستان سے باہر نکلنے والے راستے کی جانب چل پڑا!

☆☆☆

وہ منزل ابھی نہیں آئی

وہ آدھے گھنٹے سے بس اسٹاپ کے ذرا آگے، سڑک کی بائیں جانب کھڑا ہوا تھا۔ لاریاں دندناتی ہوئی، بازو سے گزر جاتیں۔ کتنی ہی کاریں جاتی رہیں۔ جب بھی کوئی موٹر سائیکل یا اسکوٹر آتی ہوئی نظر آتی، وہ لپک کر اپنے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا آگے کر دیتا۔ ایک دم پکار اٹھتا ''لفٹ!'' لیکن کوئی اسکوٹر نہ رکتی۔ وہ غیر ارادی طور پر بڑبڑاتا ''اس کی تو......'' کبھی کبھی کوئی گندی گالی بھی اس کے منہ سے نکل جاتی۔ گالیوں سے تو اس کا دن رات کا ساتھ تھا! وہ نوکری بھی ایسی جگہ کرتا تھا جہاں، م الک سے لے کر اس کے ساتھ کام کرنے والے سارے لڑکے، اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ بغیر گالیوں کے استعمال کے کام لینا اور کام کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

گالیوں کے علاوہ، مالک کبھی ہاتھوں اور لاتوں سے بھی کام لیتا۔ ایسا نہیں تھا کہ کام میں کوتاہی کرنے والوں کے ساتھ ہی مالک ایسا سلوک کرتا تھا! داصل مالک کے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ وقتاً فوقتاً، مار پیٹ سے کام کرنے واے قابو میں رہتے ہیں! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مالک کے کچھ دوست اس سے ملنے آجایا کرتے۔ جب ان کی تفریح طبع کے لئے بھی مالک، اپنے ہاتھوں اور لاتوں کا استعمال کرتا تھا۔ اس کے دوست بہت محظوظ ہوتے، بلکہ ان میں سے کوئی خود بھی آگے بڑھ کر ایک آدھ ہاتھ رسید کر دیتا۔ کارخانہ کا ماحول ہی ایسا تھا۔ وہ بلڈنگ کے کارخانے کا ملازم تھا۔ اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں کے مختلف حصوں کی ویلڈنگ وہاں کی جاتی تھی۔ کام صبح سے لے کر رات دیر گئے تک چلتا رہا۔ گاڑیاں آتی رہتیں۔ لڑکے کام کرتے رہتے۔ مالک زیادہ تر گالیاں بکنے یا سگریٹ پھونکنے میں مصروف رہتا۔ دوپہر میں، باری باری ایک لڑکا کارخانے کے پچھلے حصے میں اپنا ٹفن کیریر لے کر چلا جاتا اور جلدی جلدی، پانی گھونٹوں کے ساتھ حلق میں نوالے اتار کر پھر کام پر لگ جاتا۔

جہانگیر بھی پچھلے تین برسوں سے ہی کام کر رہا تھا۔ اس وقت سے جب کہ وہ آٹھ برس کا تھا اس کے باپ نے، جو رکشا چلایا کرتا تھا، اسے اسکول سے اٹھا کر، مالک کے سامنے کھڑا کرتے

ہوئے کہا تھا ''صاحب! آج سے یہ لونڈا آپ کے حوالے کررہا ہوں۔اسے کام سکھاؤ۔آدمی بناؤاوراس سے کام لو!'' اورتب سے وہ آدمی بننے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔

اسکول کا تجربہ بھی اس کے لئے کچھ ایسا خوشگوار نہیں تھا۔اس کا اسکول' پرانا شہر کی ایک بوسیدہ عمارت میں واقع تھا۔کلاس میں بیٹھنے کے لئے کرسیاں نہیں تھیں۔بس ماسٹر ہی' کرسی پر بیٹھتا تھا۔سب لڑکے' نیچے فرش پر بیٹھتے تھے اور جو کچھ ماسٹر پڑھاتا تھا' اسے طوطوں کی طرح دہراتے رہتے۔سبق یاد نہ کرنے پر ماسٹر' ایک پتلی سی چھڑی سے اس بری طرح مارتا تھا کہ لڑکے بلبلا اٹھتے تھے۔کتابیں بہت کم لڑکوں کے پاس تھیں۔اسکول میں پینے کے لئے پانی بھی نہیں ہوتا تھا۔بارش میں' کلاس کی چھت ٹپکتی تھی اسی لئے جہانگیر بھی اسکول جانے سے کتراتا تھا! جیسے تیسے اس نے دو درجے کامیاب کیے۔بس تھوڑی سی اردو اور انگریزی حروف سیکھے تھے کہ اس کے باپ کا رکشا بک گیا! کرایے پر رکشا لے کر چلانا شروع کیا تو کھانے کے لالے پڑ گئے۔گھر میں کھانے والے سات لوگ تھے۔ماں باپ دو چھوٹے بھائی اور دو بہنیں۔اور وہ خود۔ماں قریب میں کسی مکان میں ماما کی نوکری کرتی تھی۔جہانگیر کو اسکول میں پڑھانے کا سوال ہی نہیں تھا۔تبھی اس کے باپ نے اسے کہیں کام پر لگانے کے بارے میں طے کیا۔

ویلڈنگ کا کام بڑا ہی خطرناک تھا۔ابھی جہانگیر نے پوری طرح یہ کام سیکھا ہی نہیں تھا۔وہ اب تک سینئر ویلڈنگ کرنے والوں کے تحت' مددگار کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ویلڈنگ جو بھی کرتا' وہ کالی عینک آنکھوں میں لگائے ہوئے ہوتا لیکن مدد کرنے ولوں کو کوئی عینک نہیں دی جاتی تھی۔کبھی کبھی' تیز روشنی کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں چنگاریاں اڑ کر اس کے جسم کے کسی کھلے حصے سے چمٹ جاتیں تو وہاں چھالے پڑ جاتے۔ایک بار تو ویلڈنگ مشین کا سرا اس کی کہنی سے رگڑ کھا گیا اور کہنی کا بڑا سا حصہ جل گیا۔وہ چیخیں مارتا ہوا اپنے پیر پٹکنے لگا۔آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔مالک نے اسے فوراً قریب کے کسی ڈاکٹر کے پاس بھجوادیا۔وہاں اسے انجکشن لگایا گیا۔پھر اسے گھر بھیج دیا گیا۔رات بھر وہ درد کی شدت سے چیختا رہا۔اور اس کی ماں' اس کے مالک اور اس کے باپ کو کوستی رہی۔صبح تک جلا ہوا حصہ گھاؤ سا بن گیا تھا۔پانچ چھ روز تک وہ کارخانے جا نہ سکا۔جب زخم مندمل ہونے لگا تو اس کے باپ نے کہا ''اب آرام بہت ہوگیا۔اب کام پر چل!'' اس کی ماں نے سختی سے مخالفت کی۔کسی اور کام پر لگا دینے کیلئے کہا

لیکن اس کا باپ کہاں مانتا تھا! وہ جہانگیر کو گھسیٹ کر پھر اسی کارخانے میں لے گیا۔

ایک اسکوٹر زن سے، اس کے ہاتھ ہلانے کے باوجو گزر گئی۔ ''سالے! اکیلے اسکوٹر پر جاتے ہیں۔ اگر پیچھے کسی کو بٹھالیا تو ان کے باپ کا کیا جاتا ہے!'' اس نے آہستہ سے خود سے کہا۔ ''اگر اس کے پاس اسکوٹر ہوتی۔ تو'' خیر! اس کے پاس اسکوٹر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسکوٹر تو روپے والوں کے پاس ہوتی ہے۔ جیسا اس کا مالک تھا۔ اس کے ہاں تین اسکوٹر تھے اور ایک کار، جو ٹیکسی چلتی تھی۔ ایک بار، اپنے ساتھ لڑکے کے ساتھ، مالک کے کسی کام کے لئے اس کے مکان پر گیا تھا۔ کیا شاندار مکان تھا! بڑے بڑے کئی کمرے۔ پنکھے لگے ہوئے۔ ٹی۔ وی، فریج سبھی کچھ تھا۔ بیٹھنے کے لئے بڑے بڑے خوشنما صوفے۔ گھر والے بھی سب صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کیا شان تھی! اور ایک اس کا مکان تھا! مکان؟ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔ مکان کیا تھا؟ اسبطاس کی چھت والا ایک کمرہ تھا جس میں سات لوگ رہتے تھے۔ پانی میونسپلٹی کے نل سے لانا پڑتا تھا۔ اطراف میں ایسے کئی اور گھر تھے۔ کھلی ہوئی موریاں تھیں۔ چاروں طرف گندگی اور کیچڑ کے ڈھیر...... بارش ہوتی تو مکانوں میں پانی داخل ہو جاتا۔ سامان بچانا مشکل ہو جاتا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟

ایک اور اسکوٹر پھر سے گزر گئی۔ اس کے پاؤں تو اب بے حد دکھنے لگے تھے۔ کھڑے رہنا دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔ آج کا دن ہی بڑا منحوس تھا! ایک تو کارخانے میں کام بہت زیادہ تھا۔ کام کرتے کرتے، شام تک کمر دوہری ہو گئی تھی۔ کچھ گاڑیاں، شام تک ٹھیک کر کے دینی تھیں پھر آج دولڑکے غوثو اور احمد نہیں آئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اسے کارخانے میں ہی دس بج گئے۔ نارائن گوڑے سے اپنا ٹفن باکس لے کر اسے ایک فرلانگ تک بس اسٹاپ تک جانا پڑا۔ بس بھی کافی دیر سے آئی۔ بیس پچیس منٹ میں وہ مہدی پٹنم گیا جہاں سے اسے حکیم پیٹ کے لئے، دوسری بس پکڑنی تھی۔ بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو سکتے میں آگیا...... یادا! یہ روپے کہاں گئے؟ اس کی جیب میں بیس روپے تھے۔ شاید بس میں کسی نے اڑ لیے یا جیب سے گر گئے! اس نے جیب کو ٹٹولا۔ کوئی سوراخ بھی نہیں تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ بس کے ٹکٹ کے لئے اس کے پاس اب ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس میں جیسے جا سکتا تھا؟ پورے دن کی کمائی الگ وہ گنوا بیٹھا تھا۔ گھر پر باپ کی پوچھ گچھ اور مار پیٹ کا خیال اسے اور بھی

ستائے جا رہا تھا۔ پھر بھی اسے گھر تو پہنچنا ہی پڑے گا! کسی سے لفٹ لینے کے سوائے کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن لفٹ ملے بھی تو......

اب کہیں کہیں روشنیاں گل ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے جسم کا انگ انگ درد کر رہا تھا۔ بھوک سے الگ حالت بری تھی۔ دوپہر کے تین بجے جو تھوڑے سے چاول کھائے تھے وہ کبھی کے ہضم ہو چکے تھے۔ اب اپنے آپ کو وہ بے حد نڈھال محسوس کر رہا تھا۔

ایک اسکوٹر دور سے آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے' زور سے ''لفٹ لفٹ'' پکارنا شروع کیا۔ ایک بڑی سی مونچھوں والا آدمی اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا' اسکوٹر پر آگے بڑھ گیا۔'' سال! اس کے منہ سے نکلا۔ وہ کب تک اسی طرح کھڑا رہے گا؟ اس کی ماں پریشان ہو رہی ہوگی۔ رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ اس نے ابھی تک اس کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ اس کے پیر بے حد دکھ رہے ہیں۔ بھوک سے پیٹ میں جلن سی ہو رہی ہے لیکن اب یہاں ٹھہرے رہنا بے کار ہے! اب اسے چلنا ہی ہوگا۔

اور اس نے تیزی سے چلنا شروع کیا۔ آگے کہیں کہیں روشنی تھی' سڑک پر اب زیادہ ٹریفک نہیں رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی اسکوٹر یا لاری اس کے بازو سے گزر جاتی لیکن اب وہ کسی اسکوٹر کی جانب دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں بس ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح گھر پہنچ جائے۔ اس کے پیر بڑی مشکل سے اٹھ رہے تھے۔ پیٹ میں ایک غبار سے اٹھ رہا تھا۔ اس کے گندے کپڑے' پسینے سے اس کے جسم پر چمٹتے جا رہے تھے' کہ پیچھے سے ایک اسکوٹر اس کی بغل میں آ کر رکا۔ اسکوٹر سوار نے اپنا ہارن بجاتے ہوئے پوچھا ''کہاں جانا ہے'' اس نے پلٹ کر اسکوٹر سوار کو دیکھا اور یہ کہتے ہوئے چلتا رہا کہ اسے اپنی منزل کی طرف جانا...... منزل جو ابھی بہت دور تھی بہت دور...... بہت دور...... مگر اسے چلتے رہنا ہے۔ چلتے رہنا ہے...... کیونکہ...... چلتے رہنا ہی زندگی ہے!

''آگ اور پیمبری''

چاروں طرف ایک شور برپا تھا۔ لوگ مسلسل آرہے تھے۔ کچھ حضرات انتظام کے سلسلہ میں دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ فلڈ لائٹس کی بے پناہ روشنی سے ویڈنگ ہال بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ بچے' اسٹیج کے اطراف شور مچارہے تھے۔

ابھی ابھی نکاح کے مقررہ وقت کے دو گھنٹے کے بعد نوشہ کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ قاضی صاحب ایک بار آنے کے بعد کہیں اور جاچکے تھے اور دوبارہ نہیں لے آنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

نصیر اپنا ویڈیو کیمرہ لے کر' اسٹیج کو کور کررہا تھا۔ کئی بار اسے یہ خیال آیا تھا کہ جہاں نوشہ براجمان ہیں وہاں اسے ہونا چاہئے تھا! کتنی عجیب بات تھی کہ جس لڑکی کے رشتے کے لئے اس کی ماں اپنی خالہ زاد بہن کے ہاں گئی تھیں اور انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا' اس لڑکی ریحانہ کی شادی فلمبند کرنے کے لئے اسے ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس نے اس ذمہ داری سے بچنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اپنے ماموں کے اصرار کی وجہ سے مجبور ہوگیا۔

نصیر اچھا خاصا خوش شکل نوجوان تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ ریحانہ بھی اسے پسند کرتی ہے لیکن ریحانہ کے والد عبدالقادر صاحب کو جو ایک معتبر سرکاری عہدے سے چند برس قبل وظیفے پر علیحدہ ہوئے تھے نصیر کو داماد کے طور پر قبول کرنا گوارا نہیں تھا۔ بھلا ان جیسا معزز شخص اپنی لڑکی کا رشتہ ایک معمولی ویڈیو گرافر سے کیسے کرسکتا تھا؟ مانا کہ نصیر ایک ہونہار اور شریف نوجوان تھا لیکن عبدالقادر صاحب اپنی اکلوتی لڑکی کا بیاہ' کسی باہر کے لڑکے سے کرنا چاہتے تھے یعنی ان کا داماد مشرق وسطیٰ میں کسی اچھی ملازمت سے وابستہ ہو یہی ان کی دیرینہ خواہش تھی اور انہیں لڑکا ملا بھی ایسا ہی۔ گو عمر کے لحاظ سے وہ تیس برس سے زیادہ کا ہی تھا لیکن نوکری معقول تھی اور اس کے خاندان کے کئی افراد ہندوستان کے باہر ملازمت کرتے تھے۔

نصیر نے اپنا کیمرہ اب شرکت کرنے والوں کی جانب پھیر لیا تھا۔ وہ جب گیارہ برس کا تھا تبھی اس کے والد ایک حادثے کا شکار ہوکر اس دنیا سے چل بسے۔ جیسے تیسے اس نے میٹرک

کامیاب کیا تھا۔ بیوہ ماں کی سکت نہیں تھی کہ اپنے بیٹے کو آگے تعلیم دلا سکے۔ مجبوراً نصیر نے اپنے ایک واقف کار کے فوٹو اسٹوڈیو میں ملازمت کر لی۔ اس نے فوٹو گرافی کے تمام گُر سیکھ لیے اور جلد ہی، تقریبات میں فوٹو گرافی کے لئے مالک نے اسے بھیجنا شروع کر دیا۔ پھر ویڈیو کیمرے کا چلن شروع ہوا تو وہ ویڈیو گرافر بن گیا۔ چند برسوں میں ہی اس نے اتنی ترقی کر لی کہ ایک اسٹوڈیو کا مالک بن بیٹھا۔ ان ہی دنوں، اس کی ماں اس کا رشتہ ریحانہ کیلئے مانگنے گئی تھیں۔ انہیں بھروسہ تھا کہ ان کی بہن اور بہنوئی یہ رشتہ قبول کر لیں گے۔ بہن تو رضامند ہو گئیں لیکن بہنوئی نے سختی سے انکار کر دیا۔ نصیر کیلئے یہ انکار سوہان روح ثابت ہوا۔ کئی ہفتوں تک وہ کھویا کھویا رہا۔ اس کی ماں یہ دیکھ کر کڑھتی رہیں لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ نصیر نے بھی آہستہ آہستہ حالات سے سمجھوتہ کر ہی لیا!

اچانک شور ہوا کہ قاضی صاحب آ گئے۔ قاضی صاحب کو فوراً اسٹیج پر پہنچا دیا گیا۔ تبھی اسٹیج کے قریب سے، زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھریں۔ نصیر نے کیمرہ چلاتے چلاتے ادھر دیکھا۔ ایک صاحب جو شاید دولھا کے والد تھے، عبدالقادر صاحب سے اونچی آواز میں کہہ رہے تھے۔ ''جناب! میرا لڑکا کوئی ٹٹ پونجیا نہیں ہے۔ اس کے لئے ہزار رشتے آئے تھے ایک سے ایک شاندار لیکن میں نے آپ کا رشتہ قبول کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جہیز کے نام پر ہمیں دھوکہ دیں؟ آپ نے بے حد معمولی سامان ہمارے سر پر تھوپ دیا ہے۔''

عبدالقادر صاحب بولے ''یہ موقع ان باتوں کا نہیں۔ آپ کو اعتراض تھا تو کل ہمیں بتلا دیتے۔ میں نے جو کچھ بھی دیا ہے اپنی حیثیت سے زیادہ دیا ہے۔ یہ باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں!

دولھا کے والد نے غصے سے تقریباً چیخ کر کہا ''اجی جناب! آپ کیا اور آپ کی حیثیت کیا؟ یہ جہیز تو ہم اپنی نوکرانی کے بیاہ میں بھی نہ دیں۔

عبدالقادر صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا ''آپ زبان سنبھال کر بات کریں۔ خبردار آگے جو ایک لفظ بھی کہا تو......''

دولھا کے والد نے بھی چلاتے ہوئے کہا ''بس بس! بہت ہو گیا۔ مجھے اب یہ نکاح منظور نہیں۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دولھا کی جانب بڑھے۔ چاروں طرف کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اچانک نصیر کے ماموں آگے بڑھے

اور انھوں نے دولھا کے والد کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا ''خدا کے لئے جلدی اور غصے میں کوئی قدم نہ اٹھایئے۔ جہیز کے بارے میں آپ جو کچھ بھی مطالبہ رکھتے ہیں۔ میں بعد میں اسے پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ خدا کے لئے ہماری عزت کا خیال کیجئے!

عبدالقادر صاحب غصے سے کانپتے ہوئے بولے ''وسیم! تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔ مجھے ان لالچی لوگوں کی اصلیت کا، خدا کا شکر ہے کہ وقت پر پتہ چل گیا۔ اب میں خود اپنی بیٹی کا نکاح، اس شخص کے بیٹے سے کرنے راضی نہیں ہوں۔ انھیں جانے دو......''

ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ دولھا کے والد نے فوراً اپنے بیٹے کو اسٹیج سے اٹھ جانے کیلئے کہا۔ فرماں بردار بیٹا فوراً اٹھ گیا۔ دولھا کے سب رشتے دار بھی جانے کیلئے تیار ہوگئے۔ نصیر ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ یہ تو کسی ہندوستانی فلم کا سین معلوم ہوتا ہے۔ بے چاری ریحانہ کا کیا حال ہوگا؟ وہ تو غیرت کے مارے زندہ درگور ہو جائے گی۔ دولھا کے تمام رشتے دار رخصت ہو رہے تھے۔ یہ بات زنانے تک بھی پہنچ چکی تھی اور اب وہاں سے کچھ عورتوں کے رونے کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ قاضی صاحب حیران و پریشان اٹھ کھڑے ہوگئے تھے اور جانے کی اجازت مانگنے عبدالقادر صاحب کے قریب جا پہنچے۔

عبدالقادر صاحب نے بلند آواز سے کہا '' قاضی صاحب! آپ تشریف رکھیں یہ نکاح ضرور ہوگا......!''

قادر صاحب بولے ''ہاں! ہاں! یہ نکاح ضرور ہوگا ......'' پھر انھوں نے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ اچانک نصیر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ قادر صاحب اسے گھور رہے تھے۔ ''بیٹا نصیر! کیا تم ریحانہ سے نکاح کرنے راضی ہو؟ نصیر کے پاؤں تلے جیسے زمین ہی نہ رہی۔ اس کے منہ سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ انھوں نے پھر کسی قدر زور سے کہا ''تم ریحانہ سے نکاح کرنے راضی ہو......؟'' نصیر کے منہ سے پھر بھی آواز نہ نکلی لیکن غیر ارادی طور پر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

قادر صاحب بولے ''تو پھر آؤ...... قاضی صاحب! آپ تشریف رکھیں اب میری بیٹی کا نکاح اس نوجوان سے ہوگا! افسوس کہ میں نے شرافت کو پرکھنے میں اتنی بڑی غلطی کی! اللہ مجھے معاف کرے!......

تھوڑی ہی دیر میں، نصیر اور ریحانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بندھن میں بندھ گئے!

☆☆☆

کھویا ہوا ایک لمحہ

اس کی کار جب راکسی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا چاروں طرف سر ہی سر نظر آرہے ہیں۔ افوہ! کیا ہجوم ہے!! اس نے سوچا وہ کیسے فوئر تک پہنچ سکے گی؟ اس نے نظر اٹھائی۔ سارا راکسی سینکڑوں روشنیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اچانک پبلک کے شوروغل میں اضافہ ہو گیا۔ رومال بے تحاشہ لہرانے لگے...... گلے چیخ اٹھے اور سروں کے سمندر نے یک بیک کروٹ سی لی۔ وہ جھوم اٹھی ہجوم نے شاید اسے دیکھ لیا تھا۔

اسی کے خیر مقدم کی گرما گرمی تھی۔ اس نے خوشی سے سرشار ہو کر ہاتھ ہلایا۔ لیکن تبھی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ کوئی اور بھی ان گرم جوشوں میں اس کا حصہ دار تھا۔ اور شاید اس سے بھی بہت زیادہ۔ وہ کون تھا؟ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ شیلا تھی۔ اس کے دل میں جیسے کوئی چیز ٹوٹ کر رہ گئی...... ایسی چیز جو شیشے سے بھی زیادہ نازک تھی تو کیا وہ اس حد تک اپنی مقبولیت کھو بیٹھی ہے؟ اچانک کوئی چیخ اٹھا۔

''مالتی زندہ باد...... مالتی زندہ باد'' اور پھر بہت سے لوگ چیخ اٹھے۔

وہ مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ اس پھول کی طرح تھی جسے ابھی ابھی کچل دیا گیا لوگ پیچھے شیلا زندہ باد کے نعرے لگاتے دیوانے ہوا ٹھے تھے!

وہ جب کار سے اتری تو مصرا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آ پہنچا۔ ''بڑی دیر لگا دی۔ مالتی بائی اپن تو سمجھا تم آئینگی نئیں۔ جلدی چلو شو چالو ہو رہا ہے؟ کچھ فوٹو گرافرس اس کی طرف لپکے، بلب چمکے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا شیلا گلابی رنگ کی جارجٹ کی ساڑی میں بالکل کھلا ہوا گلاب معلوم ہو رہی تھی۔ سیٹ کئے ہوئے بالوں میں اس کا بے حد میک اپ کیا ہوا چہرہ بڑا خوبصورت لگ رہا تھا اور بلب اس کے لئے سورج بن گئے۔ وہ اپنی بہن کو ساتھ لئے مصرا کے پیچھے ہولی۔ راستے میں اس نے پریمیر ہونے والی فلم کے پروڈیوسر ڈائرکٹر جھن جھن والا...... کہو اچھی تو ہو

...... بہت دنوں بعد نظر آئیں۔ کہیں ...... اہا شیلا نمستے! قسم بھگوان کی اگر تم نہ آتیں تو یہ شو ہی نہیں ہونے دیتا۔ منسٹروں کا کیا ہے جب بلاؤ چلے آتے ہیں لیکن مالتی دوسری طرف مڑ گئی۔ اس کی بے چین نظروں کو کسی کی تلاش تھی۔ شاید اس کی جو اس فلم کا ہیرو بلکہ روحِ رواں تھا۔ انڈسٹری کا سب میں مانا ہوا اداکار جس پر روپیوں کی بارش ہوا کرتی تھی۔ جس پر شہرت کی دیوی دل و جان سے نچھاور تھی۔ جس کے لئے قسمت ہمیشہ مسکرایا کرتی تھی لیکن وہ کہاں تھا؟ کہاں؟

''ہیلو کملا''

''ہیلو''

ہیلو مالتی''

''اوہ جمیلہ کیسی ہو''

''ہیلو نیلوفر''

''ہیلو''

''ہیلو''

سبھی لوگ ہیں۔ پروڈیوسرز۔ ڈائرکٹرز' ہیروئن ...... مگر وہ کہاں ہے ...... اچانک وہ اسے ایک طرف نظر آ گیا۔ بڑی پیاری تراش کے نیلے سوٹ میں ملبوس خاصا جچ رہا تھا اور ہونٹوں پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی ...... وہی قاتل مسکراہٹ

''ہل ...... لو مالتی! اس نے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ ''تم آئی ہو ...... کیسی ہو؟ اچھی تو ہو نا؟

''ہاں اچھی ہوں'' اس کے دل میں ایک کسک سے تیر گئی۔ ''تم کیسے ہو؟''

''یہ تم تو انتہا کر رہے ہو راجیش'' شیلا نے ایکٹنگ کی۔ ''تم تو ڈے بائی ڈے اسمارٹ ہوتے جا رہے ہو۔''

ذلیل کہیں کی کتنا بنتی ہے!

مالتی نے نفرت سے سوچا اور اطراف نظر دوڑائی۔ قریب ہی میں ہوم منسٹر صاحب کئی ہیروئنوں کے گھیرے میں کھڑے راجہ اندر لگ رہے تھے۔

''راجیش صاحب! مدھوبوس آئی ہے۔ سنا ہے آپ نے کافی جھنڈے گاڑے ہیں۔ اب

کے بھئی آپ کو پروڈکشن (Co-production) کیوں نہیں لیتے؟ ہالی ووڈ۔ ایران۔ اجیٹ۔ آپ جیسے عظیم......''

''دیکھیں!'' راجیش مڑ گیا ''افوہ شیلا! کیا کھل رہی ہو آج! قسم خدا کی یہ گلاب کا باغیچہ...... ہاہا۔''

''بنرجی صاحب! آیئے آیئے میں آپ کو آنرایبل منسٹر سے ملواؤں'' وہ آگے بڑھ گیا۔

مالتی نے خواہ مخواہ اپنا پرس کھولا اور اندر جھانکنے لگی۔

کمبخت اب میری نوٹس تک نہیں لیتا۔ اور ایک زمانہ وہ تھا جب کہ میں اس کے ساتھ ہر فلم میں آیا کرتی تھی...... کیا دن تھے وہ بھی! کیسے حسین حسین خوابوں کے تانے بانے بنے تھے اس نے اس کے خیالات کے افق پر کتنے ہی خوبصورت رنگ ابھر آئے۔ ان دونوں کا نام تھا...... راجیش اور مالتی۔ مالتی اور راجیش۔ ایک فلم کی کامیابی کئی فلموں کی کامیابی...... کامیابی کا پیچھا کرتا ہوا کتنا حسین تعاقب تھا وہ' پھر نہ جانے یکا ایکی کیا ہوا کہ وہ اس سے بچنے لگا۔ اس نے جاننے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی...... پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے اسے بھلانا شروع کیا۔ وہ اے کلاس فلموں سے بی کلاس فلموں تک آ گئی۔ راجیش اسی طرح سورج بن کر چمکتا رہا۔ نئی نئی ایکٹریس اس کے ساتھ ہیروئن بننے اور شہرت کے آسمان پر جگمگانے لگیں۔ اور وہ......؟ وہ تو شاید اب سی کلاس فلموں کی ہیروئن بن جائے۔ بہت دنوں سے وہ اپنے آپ کو اس خودکشی کیلئے بھی تیار کر رہی تھی۔

''مالتی! مالتی! چلو اندر چلو...... شو شروع ہو رہا ہے۔'' جھن جھن والا بھاگتا ہوا آیا۔ وہ اندر آ گئی۔ آخر کیا کمی تھی اس میں؟ اب بھی وہ پہلے جیسی ہی خوبصورت ہے۔ آواز کی کھنک میں وہی رعنائی ہے۔ ایکٹنگ میں تو اب بھی اس کا جواب نہیں۔ پھر یہ کون سا کھیل اس کے ساتھ قسمت کھیل رہی تھی۔

پکچر شروع ہوئی۔ ایک گھنٹہ...... دو گھنٹے...... تین گھنٹے۔ تین گھنٹوں تک وہ اپنے آپ سے بے خبر رہی۔ اس کی فنکار روح اس فلم ہی کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ کتنی مکمل فلم تھی! خوبصورت کہانی...... لاجواب فوٹو گرافی...... رسیلی موسیقی ماہرانہ ہدایت کاری اور سب سے بڑھ کر راجیش کی بے مثل اداکاری۔ کیا بین الاقوامی معیار کی اداکاری کی تھی کمبخت نے! ایک ایک سین

پر اس کی اعلیٰ فنکاری کی چھاپ تھی۔ ہال جگمگا اٹھا اور ساتھ ہی تالیاں گونج اٹھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر سامنے کی رو میں بیٹھے ہوئے راجیش کی پیشانی چوم لے۔ لیکن ......؟ وہ انتظار کرنے لگی ...... یکے بعد دیگرے لوگ اسے گرمجوشی سے مبارکباد دے رہے تھے۔ جب دھڑکتے دل کے ساتھ وہ پہنچی تو راجیش اور لوگوں سے کسی قدر ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔

''راجیش'' وہ جیسے خواب میں بولی۔ کچھ دیر راجیش کی آج کل کی چہیتی ہیروئن شیلا اپنی سہیلی شانتا کماری سے زور و شور سے بحث کرنے میں مشغول تھی۔ راجیش نے بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''راجیش۔ تم عظیم ہو...... مجھے فخر ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ کام کیا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ تمہیں پوجتی ہوں۔''

اچانک وہ گھبرا کر رک گئی۔ وہ کیا کہہ گئی تھی؟ لیکن کوئی اندر سے اسے کہتے رہنے پر اکسا رہا تھا۔ ''بھگوان کرے تم ہزاروں سال جیو...... ہمیشہ ہنستے رہو۔ اور میرے جیسی ہزاروں ہیروئن تمہارے ساتھ کام کر کے شہرت اور فنکاری کی معراج کو پہنچیں اور پھر سی کلاس فلموں کی پاتال میں گرتی رہیں۔'' اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی'' اب ......اب میں چلوں گی'' وہ مڑ گئی بیچ فوئر سے جب وہ اپنی بہن کو ساتھ لے کر چلنے لگی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ خوب جی بھر کر روئے۔

اس دن صبح وہ دیر تک سوتی رہی تھی۔ رات کے تین بجے تک مرچنڈانی کی بوگس فلم'' آدھی رات'' میں اسے کام کرنا پڑا تھا۔ پھر واپس گھر آ کر وہ میک اپ کافی دیر تک اتارتی رہی۔ فلم میں انٹرول کے بعد وہ ایک بوڑھی عورت بنی تھی۔ بدن کا ایک ایک حصہ ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر بلانکٹ پیروں سے ہٹایا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی ستیش بھاگتا ہوا آیا۔'' دیدی! اٹھو جلدی۔ راجیش صاحب کا فون آیا ہے۔''

''راجیش صاحب کا؟'' اس کا دل حلق میں اٹک گیا۔ ''جھوٹ تو نہیں کہہ رہا ہے''۔

''قسم! یقین نہ ہو تو ......'' وہ بے تحاشہ بھاگی۔ فون اٹھاتے وقت وہ کانپ رہی تھی۔

''ہیلو......'' اس کی آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔

''مالتی ! یہ میں ہوں راجیش ! تمہیں ایک خوشخبری سنانا ہے۔ میں نے آئندہ فلم کیلئے تمہیں ہیروئن چنا ہے۔''

''کیا؟'' مالتی دم بخود ہوگئی۔ لیکن راجیش......مگر......تم......؟

''اور سنو! کل ہی مہورت ہے۔ سویرے آجانا۔ دس بجے تک سمجھیں؟ اچھا اب ٹاٹا'' وہ فون رکھ کر مڑی تو اس کے پیر کانپ رہے تھے۔

''دیدی! ادھر آؤ۔ تم سب۔ آج میں نے دنیا جیت لی ہے۔''

جب سب بھاگ کر آئے تو انھوں نے دیکھا...... مالتی صوفے پر بیٹھی رو رہی تھی......''

☆☆☆

نئے فرہاد

بڑے بھائی جان' بڑی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے ہیر آئیل سے چپڑے بظاہر بکھرے ہوئے لیکن دراصل بڑی ہی توجہ سے بنائے گئے بالوں کی سیاہی کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں بار بار جھپک رہی تھیں۔ کسی قدم چپٹی سی ناک پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے جمع تھے۔ کیلوں اور مہاسوں سے بھرا ہوا چہرہ جسے کولڈ کریم سے چکنایا اور اجیالا گیا تھا' چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ جوانی آئی ہے اور دھڑلے سے بے شمار امنگوں اور خواہشوں پر سوار آئی ہے۔ دبلے پتلے کھجور کے جسم پر ریشمی ململ کا کرتا' اندر پہنی ہوئی بنیان کی پردہ داری کر رہا تھا۔ ساتھ میں ہر کے کا پاجامہ سفید سی چپل پر خوب میچ کر رہا تھا' اور......

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آخر ان کے سراپا کی اتنی وسیع تصویر کھینچنے پر کیوں تلا ہوا ہوں۔ درحقیقت بڑے بھائی جان ہیں ہی گریٹ آدمی۔ اب یہی دیکھئے نا کہ...... لیکن نہیں...... میں پہلے آپ کو اس بے چینی کی وجہ بتا دوں۔ بات یہ تھی کہ بھائی جان نے بہت عرصے سے دیوان خانے کو اپنا ریڈنگ روم بنا لیا تھا۔ یہیں ان کی کتابیں شیلف میں بڑے سلیقے سے جمع رہتیں وہ ایک کتاب نکالتے' کچھ دیر تک اس کے ٹائٹل کو گھورتے پھر فہرست پر غور کرتے اور اچانک ان کی نظریں سامنے کے گھر کی کھڑکی پر جم جاتیں۔ جہاں سے کبھی کبھی ایک سانولا سلونا پرکشش مکھڑا' شوخی سے چمکتی آنکھیں اور پھڑکتے ہوئے ہونٹ لے کر انہیں شربت دیدار' بڑے اہتمام سے پلاتا۔

اور کسی ندیدے بچے کی طرح شربت دیدار پیتے پیتے انہیں احساس ہوا کہ اب شربت روح افزاء کی بھی ضرورت لاحق ہوگئی ہے۔ کیونکہ ان کی راتوں کی نیند جب مطلع صاف ہو تو تارے گننے اور مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں چھت کی کڑیوں کا لگاتار شمار کرنے میں رفو چکر ہو چکی تھی۔ انہیں اب جغرافیہ کے ہر نقشے' سائنس کی ہر شکل' ریاضی کے ہر سوال اور انگریزی کے ہر سبق میں صفیہ آپا کا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔

آخر کار انھوں نے ایک دن فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، سماج کے ٹھیکے داروں کی ایسی کی تیسی۔ وہ ضرور بہ ضرور ایک نامہ محبت المعروف بہ قصہ ہجر و فراق و داستانِ رنج و محن اس قتالہ عالم بہ الفاظ دیگر شعلہ جوالہ کے حضور میں پہنچائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے انھوں نے ایک خط لکھ ہی دیا، جس کا ایک جملہ مجھے یاد رہ گیا (اس لئے یاد رہ گیا تھا کہ انھوں نے یہ ایک ناول سے چرایا تھا) یہ تھا...... "تم میرے جذبات و احساسات کی دنیا پر برسات کی تند و تیز گھٹا کی طرح چھا گئی ہو۔"

یہ خط انھوں نے ابا جان کے پیڈ سے ایک صفحہ چرا کر لکھا تھا اور انھوں نے اسے خوشبودار بنانے کی کوشش کی (وہ عاشقانہ خط ہی کیسا جو خوشبودار نہ ہو) تو عطر لخلخہ کی ساری شیشی الٹ گئی۔ ناچار دوسرا صفحہ چرانا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے ننھے ارشد کو بلا کر اٹھنی (بات بہت پہلے کی ہے) اس کے ہاتھ میں تمائی اور کہا۔ "سامنے صفیہ آپا کا گھر ہے نا، ان کا یہ خط دینا، سمجھے؟ اور ہاں کسی اور کو معلوم نہ ہو خبردار!!۔ ارشد نے سر ہلایا اور تب سے

بھائی جان نے ٹہلتے ٹہلتے باہر نظر ڈالی اور ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ارشد آ رہا تھا۔ وہ کمرے میں آ گیا پھر اس نے ایک پھٹا ہوا جوتا آگے کیا۔ "یہ دیا ہے صفیہ آپا نے اور یہ بھی۔" اس نے ایک چٹھی بھی دی۔ لکھا تھا۔ "ایک بار آزمائش شرط ہے، بسم اللہ فرمائیے۔"

بھائی جان کے چہرے پر کئی رنگ بیک وقت چھا گئے۔ وہ پھر ٹہلنے لگے...... ٹہلتے رہے۔ انھیں دیکھ کر پنجرے میں گھومتے ہوئے زو کے شیر کی یاد آتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر میز پر جھپٹے، ان کا قلم فراٹے بھرنے لگا۔ "تمھاری وجہ سے کھانا پینا چھوٹ گیا ہے (حالانکہ وہ دوگنا کھانے لگے تھے) راتوں کا سونا خواب ہو گیا ہے (پھر وہی جھوٹ! نو بجے جو تان کر سوتے ہیں تو صبح ابا جان کے ڈانٹنے پھٹکارنے پر ہی اٹھتے ہیں) اور تم نے اگر میرے خط کا سنجیدگی سے جواب نہ دیا تو خودکشی کر لی جائے گی۔ اگر گھر میں رسی نہ ہو تو بازار سے منگوا کر ہی مگر پھانسی ضرور لی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

اس خط کی دھمکی کارگر ہوئی۔ دوسرے ہی دن ننھی رضیہ جواب لے آئی۔ لکھا تھا "آپ سے جو مذاق کیا تھا اسے آپ معاف کر دیں۔ دراصل مجھے بھی آپ کا کچھ کچھ خیال ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں کیوں (واہ یہ خوب رہی) لیکن یہ خط و کتابت ٹھیک نہیں۔ دنیا کیا کہے گی۔" (صاف

دعوت تھی کہ اور خط لکھ بھیجئے)

یہ پڑھتے ہی بھائی جان خوشی سے ناچ اٹھے جاپانیوں نے پرل ہاربر کے موقع پر جو جو حرکتیں کی ہوں گی تقریباً ان سے بھی سرزد ہوئیں۔ بس چھت کو تھامے ہوئے ستونوں کو گدگدی کرنا باقی رکھا۔

اس شام ان کیلئے آفتاب امید، دریچہ محبوب سے بڑے شاندار انداز میں طلوع ہوا۔ صفیہ آپا نے بہ زعم عنایت بڑی آب وتاب کے ساتھ درشن دیئے اور دیر تک یونہی وقت برباد کرتی رہیں۔ ان کا سانولا رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کاجل بنا کجلائی ہوئی تھیں۔ بھائی جان تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ آج انہیں اس چہرے کے خدوخال میں ایک نئے معنی نظر آرہے تھے۔ ایسے معنی جوان کے دماغ کی لغت میں ناپید تھے۔ کچھ دیر بعد انہیں ہوش آیا انھوں نے جھک کر سلام کیا۔ ادھر سے مسکرا کر جواب مل ہی رہا تھا کہ گلی میں ابا جان آتے نظر آئے اور صفیہ آپا غڑاپ سے اندر اور بھائی جان گڑبڑا کر غیر معمولی توجہ سے تاریخ کی کتاب الٹی پڑھنے لگے۔

''ہوں تو برخوردار پڑھائی ہورہی ہے؟'' دوسرے مضامین بھی تو دیکھا کرو۔ تاریخ! ہونہہ!۔ یہ بھی کوئی مضمون ہے؟ قسم خدا کی جب ہم طالب علم تھے تو امتحان سے ہٹ کر سال بھر کبھی نہیں پڑھا اور پھر پاس ہوتے رہے اور تم ہو کہ بدھو کے بدھو ہی رہے۔''

''جی ہاں۔'' بھائی جان نے بڑی سعادت مندی سے کہا' پھر یہ سوچ کر کہ کیا بول گئے ہیں' گڑبڑا گئے۔ ابا گھورتے ہوئے اندر چلے گئے۔

دن گزرتے گئے۔ بہاروں کی سی رنگینی اور شادابی لئے ہوئے دن' ہنستے' ناچتے اور گاتے دن اور بھائی جان اور صفیہ آپا کی خط اور کتابت رنگین سے رنگین تر ہوتی گئی۔ محبت جتانے کے ہزار طریقے ڈھونڈے گئے۔ قسمیں کھائی گئیں۔ پیمان باندھے گئے۔ ملنے کے راستوں پر غور کیا گیا۔ تدبیری جوڑی گئیں۔ آخر کار ایک ترکیب نکال ہی لی گئی۔

شہر میں حال ہی میں ''ایک اچھی فلم'' ریلیز ہوئی تھی۔ بھائیجان نے دعوت دی جو قبول ہوگئی۔ بھائی جان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ فوراً اٹھے شیو کیا' غسل کیا۔ ایک نئی قمیض اور پتلون نکالی۔ پہن کر دیر تک اکڑ اکڑ کر آئینے میں دیکھتے رہے۔

وہ شام ایک ایسی شام تھی جو بھائی جان کی زندگی میں اب تک نہیں آئی تھی۔ ان کے روئیں

روئیں میں جیسے بجلی دوڑ رہی تھی۔ ایک رکشا آپا کے گھر کے سامنے آ کر رکا۔ وہ اس میں سوار ہو گئیں چونکہ بہانہ سہیلی کے گھر جانے کا تھا۔ لہٰذا شبہ کی، گھر کی طرف سے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تھوڑی دور پر گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے بھائی جان نے ایک اور رکشا تاکا۔ دونوں رکشا آگے پیچھے ''تھیٹر'' پہنچے۔ پہلے صفیہ آپا آتش مجسم بنی ہوئی اتریں۔ پھر بھائی جان رکشا سے برآمد ہوئے۔ نگاہیں چار ہوئیں۔ پھر ٹکٹ خریدے گئے اور دونوں اندھیرے ہال میں داخل ہوئے اور ایک ویران گوشے میں بیٹھ گئے۔ ایک مردانہ ہاتھ تاریکی میں بڑھا اور ایک نازک سی کلائی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

نہ جانے پکچر کیسی تھی لیکن جب ختم ہوئی تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ دل نشیں خواب جو ان دونوں سیٹوں کے گرد بن گیا تھا، ٹوٹ گیا ہے۔ خاموشی کبھی اتنی زیادہ محوِ تکلم نہیں رہی تھی۔ اور وہ زبان بھی ان کے لئے اجنبی تھی جو ان کے ہاتھوں نے کہی، اور ہاتھوں نے سنی تھی۔ دل کی دھڑکنیں ہونٹوں میں سمٹ آئی تھیں۔

جب وہ گھر پہنچے تو دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔ بھائی جان نے گلی کے نکڑ پر رکشا رکوایا۔ صفیہ آپا کو بڑی دردمندی سے خدا حافظ کہا۔ پھر رکشا سے اتر گئے۔ وہ اترے ہی تھے کہ اچانک کوئی قریب ہی نمودار ہوا۔ ان کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

''کون شاکر؟ تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟ ابا جان کی آواز گونجی۔ ''اور یہ رکشا۔ رکشا میں کون ہے؟''

بھائی جان کانپنے لگے۔

''بولو! کون ہے؟'' ابا جان کسی قدر گرجے اور پھر آگے بڑھ کر انھوں نے پردہ دیکھا۔ صفیہ آپا گٹھری بنی بیٹھی تھیں۔ گٹھری کچھ اور سکڑ گئی۔

جب رکشا صفیہ آپا کے گھر پہنچا تو دوسری قیامت ٹوٹی۔ ان کے ابا نے ان کی سہیلی کے گھر قاصد بھجوایا تھا تاکہ انہیں جلد از جلد بلایا جا سکے کیونکہ دوسرے دن انہیں کسی عزیز کی شادی میں شرکت کرنی تھی؟ لیکن وہ ایک سہیلی تو کیا ساری سہیلیوں کے گھر چھان مارنے کے باوجود ان کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ لہٰذا قہر و غضب فطری تھا۔ اس رات دیر تک صفیہ آپا کی سسکیاں اور ان کے ابا کی دھاڑیں گونجتی رہیں۔ خود بھائی جان کو جی بھر کر ابا نے ڈانٹیں پلائی تھیں۔ کہا ''وہی تو میں

کہہ رہا تھا کہ آخر صاحبزادے کب سے ایسے پڑھا کو ہو گئے کہ دیوان خانے سے ہٹتے ہی نہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ عشق بازی کا چکر تھا۔ ''خبردار! جو آئندہ پھر ایسی حرکت کی! گولی سے اڑا دوں گا۔'' (حالانکہ پچھلی کئی پشتوں سے کسی نے بندوق کی صورت تک نہیں دیکھی تھی) خدا خدا کر کے ابا جان ہٹ گئے۔ بھائی جان کرسی پر آنکھیں بند کئے پڑے رہے اور پتہ نہیں کب سو گئے۔

صبح بھائی جان پر ہی رات کی نحوست طاری تھی۔ بال بکھرے ہوئے' چہرے پر پھٹکار برستی ہوئی' بات بات پر ٹھنڈی سانسیں بھرنا' ناشتے پر بلایا گیا تو انکار کر دیا۔ ابا جان نے کہا ''مرنے دو بدتمیز کو مفت کا کھانا کھا کھا کر عشق بازی سوجھتی ہے۔ پیٹ میں روٹی نہ پڑے تو عشق وشق سب ہوا ہو جائے گا۔'' جب ابا جان ناشتہ کر کے دفتر سدھارے تو امی' بھائی جان کے پاس ناشتہ لئے پہنچیں۔

''لے شاکر! میرے لال' ناشتہ کر لے تجھے میری قسم'' بھائی جان نے نفی میں سر ہلا دیا لیکن امی نے منہ میں نوالہ ٹھونس دیا اور انہیں مجبوراً کھانا ہی پڑا (اور کیا اگر امی انہیں کھلاتی نہیں تو وہ کھاتے ہی نہیں؟)

دن چڑھنے لگا اور برآمدے میں ان کی مخصوص کرسی ان کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ بت بنے بیٹھے رہے اور ان کی نگاہیں خلا میں بھٹک رہی تھیں۔ گلی میں سناٹا تھا۔ پھر اچانک کچھ شور سا ہوا۔ کچھ لوگوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ اٹھا پٹک ہو رہی تھی ......ننھا ارشد باہر بھاگا اور جب واپس آیا تو پوری پکی خبر لایا تھا۔

بولا۔ ''صفیہ آپا یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ ان کے ابا نے ایک بڑی سی لاری لائی ہے۔ ان کا سامان لد رہا ہے۔ بہت سے مزدور آئے ہیں۔'' بھائی جان' بیٹھے کے بیٹھے ہی رہے۔ سارا سامان لد گیا اور پھر صفیہ آپا' ننھی رضیہ' ان کی امی اور ابا بھی سدھارے اور ایک' بڑا سا قفل صدر دروازے پر منہ چڑاتا رہ گیا۔ صفیہ آپا کے ابا کے دو اور مکان خالی تھے' جن میں سے ایک میں خود ان کے بھائی کی شادی ہونے والی تھی۔ ویسے بھی وہ سہولت کی خاطر کچھ عرصے سے یہاں سے وہاں منتقل ہونے کی سوچ رہے تھے۔ اب اس واقعے (یا حادثے) نے ان کی سوچ کو عملی شکل دے دی۔ بات بھی تو ایسی ہی تھی۔ صفیہ آپا کی پہلے سے منگنی ہو چکی تھی بات پھیلتی تو......؟

معاف کیجئے نیچے کچھ گڑبڑ سی ہو رہی ہے بچے چلا رہے ہیں گلا پھاڑ کر۔ ذرا میں انہیں

ڈانٹ آؤں۔ ارے! یہ تو بڑے بھائی جان ہیں!! بڑی محبت سے ملے۔ گلے لگالیا (میں ان کا راز دار جو تھا۔ پھر وہ مجھ سے بے تکلف بھی تھے)

کافی موٹے ہو گئے ہیں۔ آنکھیں گوشت کے ڈھیر میں دبی ہوئی سی لگتی ہیں۔ بڑا قیمتی سوٹ زیب تن ہے (کیوں نہ پہنیں انکم ٹیکس آفیسر جو ہیں) چہرے کا رنگ بھی کچھ نکھر آیا ہے۔ بھابی جان بھی ساتھ اپنے تین بچوں کو لئے ہوئے موجود ہیں جو بالکل بھائی جان کی کاربن کاپی معلوم ہوتے ہیں۔ بھائی جان بڑے چرب زبان ہو گئے ہیں۔ مسلسل باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں۔ سفر کی جھنجھٹ، ریلوے والوں کی بدانتظامی، بمبئی کا خراب موسم، جگہ کی قلت، بھابی کی بیماری، ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہہ گئے۔ پھر اچانک ان کے موضوع نے پلٹا کھایا ''ارے منصور! وہ اپنے پرانے گھر کے سامنے جو لوگ تھے وہ تمہیں یاد ہیں؟ ارے بھئی! وہی حیدر آباد والے گھر کے سامنے؟''

''ہاں! ہاں!!'' مجھے یاد آ گیا اور میں نے ایک نظر بھابی پر ڈالی جو سامان کی جانچ پڑتال کرنے میں میری بیوی کے ساتھ مصروف تھیں۔

''وہ...... وہ ملی تھیں۔'' وہ کسی قدر ہنسے ''ارے بھئی! وہی جن سے میرا عشق چلا تھا۔ میں دیکھ کر پہچان نہ سکا۔ اتنی بدل گئی ہیں۔ یہ موٹا سا ڈیل لئے ایک کالے سے صاحب کے ساتھ اپنے بے شمار بچوں کے پیچھے چلا رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے شاید دیکھا ہی نہیں تھا یا شاید دیکھ کر پہچان نہ سکی ہوں گی۔ میں...... ' وہ رکے ''بھئی مجھے بڑا تعجب ہوا کہ میرا tastel پہلے کس قدر رولگر تھا۔ بھئی وہ بھدی سی عورت۔ مجھے بڑی ہنسی آئی اپنے آپ پر۔''

وہ بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسے اور میں بچارا کوشش کے باوجود ہنس نہ سکا۔

☆☆☆

آخری پودا

اسے پھولوں اور پودوں سے بڑی محبت تھی ۔ ویسے وہ خود بھی کسی پھولدار پودے ہی کی طرح تھا۔ دبلا' پتلا۔ اونچا اور وہ کسی پھول ہی کی طرح اپنے چاروں اور رنگ اور خوشبو کی پھواریں بکھیر گیا۔ جو بھی اس سے ملتا' تروتازہ ہو اٹھتا۔ اور پھول کی خوشبو ہی کی طرح اس کی حیات مختصر بھی تھی۔ بھلا اٹھارہ برس بھی اس دنیا سے رخصت لے لینے کی کوئی عمر ہوتی ہے۔

ہم نے جب وہ مکان خریدا تھا تو وہ بہت کمسن تھا۔ وہ مکان اسے بہت پسند آیا تھا۔ لیکن کچھ ہی مہینوں میں اس نے مکان کے خالی خالی محسوس ہونے کی شکایتیں کرنی شروع کردیں۔ اس کا کہنا تھا کہ بغیر پودوں کے مکان اجڑا سا لگتا ہے جب اس کا اصرار بڑھتا گیا تو میں نے چند خوشنما پودوں کے لادینے کا وعدہ کرلیا۔ پھر اس دن ہم دونوں ساتھ ہی پبلک گارڈن گئے۔ اچھے خوشنما اور پھولوں کے پودے چنے راستے میں کئی گملے بھی لے لئے۔ اس دن اس کی جیسے عید ہوگئی تھی۔ خوشی سے اس کا معصوم چہرا دمک رہا تھا۔ دوڑ کر کہیں سے مٹی بھی منگوائی اور پھر اپنے ہاتھوں سے گملوں میں مٹی بھری۔ پودے لگائے اور انہیں پانی دیا۔ جتنے پودے بچ رہے تھے انھیں کمپاؤنڈ کی دیواروں سے لگی ہوئی جگہ میں سلیقے سے لگادیا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں کے دن تھے اور وہ تمام دن اسی طرح باغبانی میں گزر گئے۔ یہ سارا کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کیا کرتا تھا۔ پودوں کیلئے' ٹوٹی اینٹوں کے ٹکڑوں سے اس نے کیاریاں بنائی تھیں۔ صبح وشام وہ ان پودوں اور گملوں کو بڑی محنت سے پانی دیا کرتا۔ جب بھی کوئی نیا پتہ یا کلی نمودار ہوتی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ کسی پودے کا ٹھٹھر جانا یا مرجھانا' اس کی حساس طبعیت کے لئے بارِ گراں ثابت ہوتا۔

تھوڑے ہی دنوں میں مکان کا کمپاؤنڈ اور سارے گملے خوشنما پودوں اور پھولوں سے مالا مال ہوگئے۔ کروٹن' پوپی' لتونیا' لوپنس' کرائی سانتامس' سلیریا اور مارننگ گلوری کے پودوں نے رنگ وبو کی ایک قوس وقزح بکھیر دی۔ مکان میں جو بھی داخل ہوتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔

مکان کے سامنے گیٹ کی دونوں جانب' دو گل مہر کے تناور درخت تھے۔ گل مہر کو سدا بہار

درخت کہا جاتا ہے۔ انھیں پانی دینے کی عام طور پر ضرورت نہیں محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن شفاعت، میرا بیٹا انھیں بھی پانی دینا نہ بھولتا۔ ہر سال مارچ کے مہینے میں، گل مہر کے یہ درخت اپنے سارے پتے جھاڑ کر، برہنگی کی پوشاک پہن لیتے۔ سارے کمپاؤنڈ کے ندر اور ٹریس (Terrace) پر بھی پتوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگ جاتے۔ لیکن درختوں کی یہ بے لباسی زیادہ دنوں تک نہ رہتی۔ اپریل اور مئی کے مہینوں کے دوران آہستہ آہستہ پتے نکل آتے۔ پھر گہرے سرخ رنگ کے پھول نمودار ہوتے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں درختوں میں ایک آگ سی لگ جاتی۔ دیکھنے والوں کی نظریں تمازت سے خیرہ ہو جاتیں۔

پھر یوں ہوا کہ مکان کے عقب میں ایک چھوٹا سا زمین کا قطعہ ہم نے لے لیا۔ ہم سب سوچتے ہی رہے کہ اس کا کیا استعمال کیا جائے؟ ایک دن، چھٹیوں کے دوران شفاعت نے صبح صبح، وہاں کی زمین کو کھودنا اور ہموار کرنا شروع کر دیا۔ کہیں سے کھاد بھی فراہم کر لی۔ پھر مجھ سے اصرار کر کے، پھولدار پودوں اور ترکاریوں کے بیج منگوائے۔ بیج بوئے گئے روزانہ وہ انہیں سینچنے میں لگا رہا۔ آہستہ آہستہ بیج کے تاج پہنے ہوئے انگوروں نے اپنا سر اٹھایا۔ ایک دن وہ گھر والوں کو یہ منظر دکھانے کیلئے خوشی خوشی لے گیا۔ اس کا معصوم چہرہ از حد مسرت اور فخر سے دمک رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے کوئی جفاکش کسان، مہینوں کی کڑی محبت کے بعد ایک بھرپور فصل کے سامنے کھڑا ہوا ہے وہ ایک شاہکار۔ جس کی تخلیق میں خدا کے ساتھ انسان بھی شریک تھا!

ان پودوں میں کچھ عرصے کے بعد پھول کھلے۔ ترکاریاں بھی اگیں۔ ٹماٹر، بھینڈی، پالک، ہری مرچ، بیگن، اور نہ جانے کیا کیا۔ ہر پودا شفاعت کیلئے عجوبہ تھا۔ قدرت کا ایک سربستہ راز جس کی گرہیں کھولنے کیلئے، پودوں کو پانی دیتے ہوئے مردہ پتوں کو چنتے ہوئے اور کیڑوں سے پودوں کو بچاتے ہوئے، وہ گھنٹوں مصروف رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا لگتا کہ وہ پودوں سے سرگوشیاں کر رہا ہے۔ دیکھو وہ پھول، اس کے کانوں میں جھک کر کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ پتہ، اس کے گال کو چھونا چاہتا ہے، وہ لمبی سی ڈالی اس کے بالوں کو سہلا رہی ہے!

انار اور جام کے پودے، دیکھتے دیکھتے اونچے درخت بن گئے۔ شفاعت بھی کسی درخت ہی کی طرح اونچا ہو گیا تھا۔ ایک دن، اس نے مجھے کمپاؤنڈ میں لگائے ہوئے کروٹن کے ایک خوبصورت پودے کو دکھایا۔ یہ پودا، غیر محسوس طرح سے بڑھتے بڑھتے اب شفاعت کے قد

کے برابر ہی ہو گیا تھا۔

لیکن قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ کچھ پودے درخت بن کر پھلتے پھولتے ہیں اور کچھ درخت بننے سے پہلے ہی مرجھا جاتے ہیں' اچانک شفاعت بیمار ہو گیا۔ اسے پہلے کبھی بخار تک نہ آیا تھا۔ اب کے بخار چڑھا تو مسلسل ویسے ہی رہا۔ علاج شروع کیا گیا لیکن بخار کم نہ ہوا۔ پھر کئی بیماریوں کا یکے بعد دیگرے شبہ کیا گیا۔ علاج ہوتا رہا۔ کمزوری بڑھتی گئی۔ ایک دن ایک ڈاکٹر نے کہا'' یہ جگر کا عارضہ ہے۔ ٹسٹ لئے گئے۔ ہسپتال میں داخل کیا گیا وہ مرجھاتا رہا۔ ہسپتال بدلے گئے۔ ڈاکٹر بدلے۔ لیکن بیماری جوں کی توں رہی! کمزوری بے حد بڑھ گئی۔ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ کھانے کے لالے پڑ گئے۔ وہ جو دوسروں کو اپنی زندہ دلی سے ہنساتا تھا' ہنسی اس کے ہونٹوں سے رخصت ہو گئی۔ اکثر وہ ہسپتال میں مجھ سے پوچھتا'' ڈیڈی! سارے گھر والے تو میری بیماری کی وجہ سے یہاں میرے ساتھ ہی ہیں۔ میرے پودوں اور گملوں کا کیا ہوگا؟'' میں تسلی دیتے ہوئے کہتا'' بیٹا! تم ان کی فکر نہ کرو۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤ تو وہ سب پودے سرسبز ہو جائیں گے'' لیکن یہ ایک جھوٹی تسلی تھی۔ آہستہ آہستہ گملوں کے سارے پودے مرجھا گئے۔ ترکاری اور پھولوں کے پودے بھی جھلس گئے تھے جہاں کل تک ہریالی تھی وہاں اب مردہ پتوں کے ڈھیر تھے۔ ایک عجیب سے ویرانی بھی۔ زمین پانی کو ترس گئی تھی اور پودوں کو پانی دینے والا خود مرجھا رہا تھا۔ گھلتا جا رہا تھا۔ بیماری میں درد کی شدت کے باوجود کبھی کبھی وہ میرے یا اپنی ماں کے ہاتھ تھام لیتا اور انہیں چومتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔'' میں آپ کو کتنی تکلیفیں دے رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا!'' ہم اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے جواب دیتے'' بیٹا! کہیں ماں باپ سے ایسے بولتے ہیں؟ تمہارے لئے ہر تکلیف برداشت کرنا ہمارے لیے راحت کا باعث ہے۔'' لیکن ہم اسے راحت نہیں دے سکے۔ اس کی تکلیفیں اس کا درد و کرب بڑھتے گئے اور۔

ایک دن وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا! جب اس کی میت گھر لائی گئی تو میں نے دیکھا سارے پودے جھلس کر ختم ہو چکے ہیں۔ کیاریاں ویران ہیں۔ مردہ پتوں کے ڈھیر لگے ہیں اور تو اور گل مہر کے دونوں تناور درخت بھی حیرت انگیز طور پر اپنے پتوں اور ڈالیوں کو جھاڑ کر ٹھنٹھ کے ٹھنٹھ بنے کھڑے ہیں! لیکن کمپاؤنڈ کے اندر' دیوار سے لگا ہوا وہ خوشنما کروٹن کا اونچا سا پودا دھول میں اٹا ہوا ساکت وصامت کھڑا ہے۔

شفاعت کے انتقال کے بعد ہمارے لئے اس مکان میں رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہوگیا تھا۔ چپے چپے سے اس کی خوشبو آتی تھی۔ مکان کے ہر دروازے اور ہر موڑ پر ایسا لگتا تھا کہ وہ اچانک ہمارے سامنے ہنستا ہوا آکر سب کو حیران کر دے گا! راتوں کو آنکھ کھلتی تو اچانک خیال آتا کہ شاید اس نے سونے سے پہلے دوا نہیں پی ہے یا بلانکٹ نہیں اوڑھی ہے! کبھی یوں محسوس ہوتا کہ وہ مکان کے سامنے کھڑا دوستوں میں گھرا ہوا کسی کی نقل اتار رہا ہو اور دوست قہقہے لگا رہے ہیں۔ کبھی لگتا کہ رشتہ دار بچوں کے بیچ بیٹھ کر کسی فلمی ہیرو کے مرنے کی نقل کر رہا ہو اور سب بچے سہمے ہوئے اسے دیکھ رہے ہوں۔ لیکن واقعی مرنے کی کیا حقیقت اداکاری وہ کرتا رہا کہ جب وہ حقیقت میں اس دنیا سے رخصت ہوا تو ہم اسے اس کا آخری سین بھی نہ سمجھ سکے!

پھر ہم نے وہ مکان فروخت کر دیا۔ وہ دن بھی آ گیا جبکہ ہمیں وہ مکان خریدار کے حوالے کرنا تھا۔ صبح صبح میں نے مکان میں داخل ہو کر، ہر چیز پر ایک الوداعی نظر ڈالی پھر باہر آیا۔ خریدار صاحب نہ آسکے تھے۔ ان کے دونوں نوجوان لڑکے موجود تھے۔ میں نے مکان کے قفل کو چابی لگائی۔ چابی خریدار صاحب کے بڑے لڑکے کے حوالے کی۔ پھر مڑا ہی تھا کہ نظر کمپاؤنڈ کے قریب کے اس کروٹن کے خوشنما پودے پر پڑی جو ہوا میں لہرا رہا تھا۔ میں ایک منٹ تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ میں اسکوٹر اسٹارٹ کر کے کچھ دور گیا ہی تھا کہ کسی کے پکارنے کی آواز سنی۔ اسکوٹر روکی اور پلٹ کر دیکھا تو خریدار صاحب کا بڑا لڑکا بھاگتا ہوا آ رہا تھا "انکل! انکل!!

"کیا ہے بیٹے؟" میں نے پوچھا۔

"انکل! ایک بات کہنا تو میں بھول ہی گیا"

"وہ کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"انکل!" اس نے آہستہ آہستہ سے کہا "میں دیکھ رہا تھا کہ مکان کے باہر نکلنے سے پہلے آپ اس کروٹن کے اونچے سے پودے کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ لگتا ہے کہ وہ پودا آپ کو بہت عزیز ہے! آپ اطمینان رکھیں ہم بھی اس پودے کو مرجھانے نہ دیں گے!"

میں نے اچانک ہوا کا ایک زوردار جھونکا اپنے چہرے پر محسوس کیا پھر آنکھوں میں ایک خوشنما پودا لہرا گیا۔ اونچا سا پودا۔ بڑا ہی معصوم!

☆☆☆

نجات

ابھی ابھی مجھے یہ خبر ملی ہے کہ احسان صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھ پر یہ سن کر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر میں اٹھا' فریج سے بوتل نکالی۔ گلاس میں پانی انڈیلا' پیا اور پھر اپنی مخصوص کرسی پر' آ کر بیٹھ گیا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ میں نے سوچا' وہ جیسی زندگی گزار رہے تھے اس سے نجات پانے کا یہی تو ایک راستہ رہ گیا تھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ اتنے دن کیسے جی گئے؟ وہ تو دراصل اسی دن مر گئے تھے جب ان کی وفا شعار بیوی اس دنیا سے سدھار گئی تھیں۔ اس کے بعد تو وہ جینے کا بہانہ کرتے رہے' ڈھونگ کرتے رہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں' دنیا نے بھی بہت دھوکے دیے تھے۔ حالانکہ بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی تمام خاندانی ذمے داریوں سے نمٹ کر ایک پرسکون زندگی گزار رہے ہیں......

ایک ہی بیٹی تھی' شائستہ' جس کی شادی انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہی کر دی تھی۔ وہ شادی کے دو برس بعد' اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ منتقل ہو گئی تھی اور اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ لڑکا' عدنان' گریجویشن کے بعد' ملازمت کیلئے کافی بھاگ دوڑ کرتا رہا لیکن اسے کئی معقول نوکری نہ مل سکی۔ تنگ آ کر اس نے باہر جانے کی ٹھانی۔ انھی دنوں' احسان صاحب نے ملازمت سے وظیفہ لیا تھا۔ وظیفے کے بعد جو کچھ رقم ان کے ہاتھ آئی' کچھ اپنے آبائی مکان کی مرمت میں اور باقی ساری رقم انھوں نے لڑکے کو' بحرین' بھیجنے میں صرف کر دی۔ عدنان کی تقدیر اچھی تھی کہ اسے چند ہی ہفتوں میں ملازمت مل گئی۔

احسان صاحب' ریوینیو (Revenue) ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ بڑے ہی محنتی' فرض شناس اور ایماندار آدمی تھے لیکن اس آخری وصف نے ہی' ملازمت میں ان کے لئے نت نئی مشکلیں پیدا کیں۔ ایک ایسے محکمے میں جہاں رشوت کا دریا بہتا ہو' احسان صاحب' محض اپنی ایمانداری کی وجہ سے' اپنے راشی ساتھیوں اور افسروں کے لئے ہمیشہ رکاوٹ بنے رہے نتیجہ یہ

ہوا کہ باوجود اپنی کارکردگی اور سخت محنت کے بار بار انکا تبادلہ دور دراز مقامات پر کیا جاتا رہا۔ ان کی گھریلو زندگی کا تانا بانا، بکھرتا رہا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ رضیہ بھابی بڑی ہی سمجھدار خاتون تھیں۔ انھوں نے گھر کے سارے کاروبار سنبھال لیے تھے اور بچوں کی تعلیم کی ذمے داری سے بھی بخوبی نبٹتی رہیں۔

عدنان کے باہر چلے جانے کے بعد، ان کی زندگی میں ایک عجیب سا، سناٹا چھا گیا۔ ایک دوسرے کا ساتھ تو تھا ہی لیکن، زندگی میں کوئی کمی سی تھی۔ انہی دنوں بھابی کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ تبھی دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب کی بار جب عدنان چھٹیوں میں آئے تو اس کی شادی کر دی جائے ......

رشتوں کی تلاش انھوں نے شروع کر دی اور ایک خاندان میں بات پکی بھی کر دی۔ لڑکی، خوش شکل اور تعلیم یافتہ تھی۔ گھرانہ معقول تھا۔ عدنان کے باہر سے آنے کے بعد ہی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ ان کا گھر آباد ہو گیا۔ ایک مہینے بعد، چھٹیوں کے ختم پر عدنان، اکیلے بحرین لوٹ گیا۔ بیوی کو ساتھ لے جانے کیلئے ویزا ضروری تھا جس کیلئے وقت درکار تھا۔ بہو اپنے سارے بھائیوں اور بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اسے سبھوں کا لاڈ و پیار ملا تھا۔ اس لئے گھریلو کام کاج اور پکوان سے اسے واقفیت نہ تھی۔ رضیہ بھابی نے اسے آہستہ آہستہ سب کچھ سکھایا۔ اب وہ سب بہت خوش تھے۔ لیکن عدنان کے جانے کے چھ مہینوں بھابی کو قلب کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکیں۔

احسان صاحب کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ ایک چھوٹی سی، خوشگوار دنیا، جو انھوں نے، اپنے گھر میں بنا رکھی تھی، وہ یک بیک ڈھے گئی تھی ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا تھا، جس کو پر کرنا، ان کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ساری باتیں جو ان کے معمول کا حصہ بن چکی تھیں، اب بے معنی نظر آنے لگی تھیں۔ ساری دل چسپیاں فضول معلوم ہوتی تھیں۔

چند مہینوں میں ہی ان کی بہو نے اپنا اصلی روپ دکھانا شروع کر دیا تھا شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے سے محرومی نے اسے عارضی طور پر ہی سہی چڑ چڑا اور ضدی بنا دیا تھا۔ اپنی ساس کی زندگی میں وہ دونوں کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتی تھی لیکن اب خسر کا خیال رکھنا اسے دوبھر لگنے

لگا۔اس کے میکے والوں کا آنا جانا بھی کچھ زیادہ ہو چلا تھا۔احسان صاحب کو اپنی بہو کی ذہنی حالت کا بخوبی اندازہ تھا اس لیے وہ زیادہ تر اپنے کام خود ہی کرلیا کرتے تھے۔عمر بھر انھوں نے اپنے کپڑے کبھی نہیں دھوئے تھے۔ان کی بیوی انھیں کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتی تھیں۔لیکن اب وہ خود ہی نہ صرف اپنے کپڑے دھوتے تھے بلکہ انھیں استری بھی خود ہی کیا کرتے تھے۔ بہو نے کبھی کسی کام سے نہیں روکا۔وہ غذا کے معاملے میں بڑے نزاکت پسند واقع ہوئے تھے۔ جب تک بیوی زندہ تھیں وہ ان کی پسند' ناپسند کا خیال رکھا کرتی تھیں۔روٹیوں میں تیل کا کم سے کم استعمال' سالنوں میں مصالحوں کا مناسب خمیر...... چائے' زیادہ گاڑھی نہیں لیکن پھر بھی لذیذ۔وہ وقت پر کھایا کرتے اور چائے بھی' انھیں وقت پر مل جایا کرتی۔وہ ناشتہ جلد کرنے کے عادی تھے۔اب یہ حال ہوگیا تھا کہ دن چڑھے' بہو بستر سے اٹھا کرتی اور نوکرانی سے الجھتے الجھتے کہیں دس یا گیارہ بجے ناشتہ تیار ہوتا۔روٹیاں دیکھ کر ان کے دل کو دھکہ سا لگتا۔موٹی موٹی بے ڈول اور آٹے سے لتھڑی ہوئی۔سالن کچے پکے...... وہ کسی طرح زہر مار کرلیا کرتے۔ دوپہر اور شام کا بھی یہی معاملہ تھا۔برتن پٹک پٹک کر اور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے بہو پکایا کرتی۔کبھی کبھی ان کا کوئی رشتے دار یا دوست آجاتا تو اس کے لئے چائے بھی بنانا دوبھر ہو جاتا۔ احسان صاحب کے پہلے دوست گنے چنے تھے اب تو جو بھی تھے انھوں نے بھی آنا بہت کم کردیا تھا۔ہر سات یا آٹھ دنوں کے بعد' بہو کو اپنے میکے کی یاد ستاتی اور اجازت لینے کے بجائے' صرف جانے کی اطلاع دے کر وہ میکے چلی جاتی۔ان دنوں ان کے کھانے کے لالے پڑ جاتے۔ نوکرانی صبح آکر' ان کے دن بھر کے کھانے کیلئے کچھ الٹا سیدھا پکا دیتی۔اگر وہ ناغہ کرتی تو انھیں بریڈ اور اچار یا جام پر گزارا کرنا پڑتا۔

اس بار بھی بہو نے کسی معمولی سی بات پر جب ان کے ساتھ بدتمیزی کی تو انھوں نے ڈانٹ دیا۔بس وہ پھر میکے جانے کے درپے ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بغیر کچھ کہے سنے لدی پھندی چلی گئی۔دوسرے دن نوکرانی بھی غائب ہوگئی۔دو دنوں تک وہ بریڈ کھا کر گزارا کرتے رہے۔سوچا کہ لڑکے کو فون کرکے سب کچھ بتادیں لیکن انھوں نے شکایت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔لڑکا سن کر پریشان ہی ہوتا۔تیسرے دن انھیں سانس لینے میں تنگی محسوس ہوئی پہلے تو وہ برداشت کرتے

رہے پھر شام میں محلے کے ایک ڈاکٹر کو بتایا جس نے کچھ گولیاں لکھ دیں۔ وہ استعمال کرتے رہے۔ ان کے پڑوسی' احمد صاحب نے کہا بھی کہ کسی اسپشلسٹ کو بتالیں لیکن انھوں نے ٹال دیا۔ تین دن اور گزر گئے۔ چوتھے دن یعنی آج صبح جب نوکرانی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو بہت دیر تک کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے احمد صاحب کو خبر کی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کے ساتھ کال بیل بجائی' دروازہ تھپتھپایا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر کار ان کے لڑکے نے کچھ لوگوں کی مدد سے زور لگا کر دروازہ توڑ ہی دیا۔

جب سب اندر داخل ہوئے تو دیکھا' احسان صاحب' بستر پر کروٹ کے بل لیٹے ہوئے ہیں اور ان کا ایک ہاتھ' بستر سے نیچے لٹک رہا ہے۔ رات کے ہی کسی پہر میں وہ دم توڑ چکے تھے!

میں نے کپڑے بدلے اور احسان صاحب کے آخری سفر کے انتظامات کرنے کیلئے گھر سے روانہ ہو گیا!

واپسی

طیارے کی اڑان کے ساتھ ہی جمیلہ خاتون کا ذہن بھی پرواز کرنے لگا۔ طرح طرح کے خیالات گردش کرنے لگے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے جان ایف کینڈی ایرپورٹ سے طیارے نے پرواز کی تھی۔ تین مہینوں سے زیادہ عرصے تک امریکہ میں اپنے بیٹے ارشد کے ہاں رہنے کے بعد وہ پھر سے ہندوستان، اپنے وطن واپس جارہی تھیں...... وہ وطن...... جہاں دنیا بھر کے مسائل تھے۔ غربت، گرانی، تنگ دستی اور...... بھیڑ بھاڑ...... لیکن جہاں پھر بھی سکون تھا۔ اپنائیت کے بندھن تھے۔ اپنوں اور غیروں سے سکھ دکھ بانٹنے کے مواقع تھے!

ویسے، انھیں ہندوستان میں بھی اپنے ایک اور بیٹے اکرم کے ساتھ ہی زندگی گزارنی تھی، جو ایک ریاستی محکمے میں عہدیدار تھا۔ اسی کی بیوی جویریہ اور اس کے تین بچوں کے ساتھ وہ رہتی آئی تھیں۔ اپنے شوہر کے انتقال سے بہت پہلے ہی اسے ان کے شوہر احمد صاحب بھی سرکاری ملازمت سے ہی وابستہ رہے تھے۔ وہ بڑے ہی وضعدار اور کفایت شعار آدمی تھے۔ اپنی ملازمت کے اختتام کے بعد ہی انھوں نے دونوں لڑکیوں کو بیاہ دیا تھا اور اب وہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں اپنے شوہروں اور اولادوں کے ساتھ خوش وخرم تھیں۔

ان کا سب سے بڑا لڑکا بچپن ہی سے بڑا فرماں بردار اور سمجھدار تھا۔ تعلیم سے فراغت پاتے ہی اس نے سرکاری ملازمت اختیار کرلی تھی۔ وہی اپنے والد کا ہر قدم پر مددگار بھی رہا تھا۔ دوسرے لڑکے ارشد کا تعلیمی کیریر بے حد شاندار رہا۔ بی ایس سی میں اس نے اعلیٰ درجے میں کامیابی حاصل کرلی تو احمد صاحب نے اچانک اسے اعلیٰ تعلیم کیلئے امریکہ روانہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان دنوں امریکہ جانا اتنا آسان نہیں تھا لیکن احمد صاحب دھن کے پکے تھے۔ جمع جتھا تو کچھ تھا نہیں اس لئے مختلف فلاحی اداروں میں انھوں نے دوڑ دھوپ شروع کردی۔ شہر میں کئی

ایسے ادارے تھے جو بیرونی ممالک اعلیٰ تعلیم کیلئے جانے والے طلبا کی اعانت کیا کرتے تھے لیکن امداد حاصل کرنے کیلئے کافی پیروی کرنی پڑتی تھی اور وقت بھی بہت لگتا تھا لیکن احمد صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور مسلسل تگ ودو میں لگے رہے۔ بالآخر کئی مہینوں کی محنت کے بعد ایک ادارے نے امداد کا بندوبست کر ہی دیا۔ ایک اور ادارے نے قرض دیا۔ باقی رقم کا انتظام اکرم نے کیا اور ایک ارشد امریکہ چلا گیا۔

ماں باپ کے لئے ارشد کی جدائی سوہان روح ثابت ہوئی لیکن اس کے اور سبھوں کے بہتر مستقبل کے لئے انھیں سینے پر بھاری پتھر رکھنا ہی پڑا۔ گھر میں دو بیٹیوں کی شادی ہونی تھی۔ احمد صاحب کے وظیفہ کے دن بھی قریب آگئے تھے۔ ارشد کی امریکہ میں تعلیم جاری تھی۔ تعلیم کے اور دوسرے اخراجات پورے کرنے کیلئے وہ جز وقتی ملازمتیں بھی کرتا رہا۔ پہلی بار جب اس نے کچھ رقم امریکہ سے روانہ کی تو احمد صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ سارے محلے میں وہ ارشد کی تعریفیں کرتے گھومتے رہے۔ ان کی ساری محنت ٹھکانے لگی تھی۔ اب وہ بڑے اطمینان سے وظیفے پر علیٰحدہ ہو سکتے تھے۔

پھر ایک دن ارشد نے انہیں خبر دی کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اسے ایک معقول نوکری مل گئی ہے۔ پھر اس نے دو مہینوں بعد ایک معقول رقم بھیجی۔ احمد صاحب نہال ہو گئے۔ ویسے اس رقم کا زیادہ تر حصہ ارشد کیلئے قرض کی ادائیگی میں صرف ہو گیا لیکن وہ ہفتوں اپنے رشتے داروں اور دوست واحباب سے ارشد کی سعادت مندی کا تذکرہ کرتے رہے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ارشد برابر کچھ نہ کچھ رقمیں بھیجتا رہا۔ ایک سال بعد اچانک ارشد نے خبر دی کہ اس نے وہیں بس جانے والے ایک حیدرآبادی خاندان کی لڑکی سے شادی کرلی ہے جو تعلیم یافتہ اور خوبصورت ہے۔ اس شادی کی چند فوٹوز بھی اس نے روانہ کی تھیں۔ لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ لیکن احمد صاحب چراغ پا ہو گئے کہ پہلے اجازت کیوں نہ لی۔ جمیلہ خاتون اور اکرم کے سمجھانے بجھانے پر وہ بہر حال ارشد کو معاف کر دینے پر راضی ہو گئے۔ کچھ ہی مہینوں میں احمد صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ اکرم کی شادی کر دی اور

بیٹوں کے بیاہ کیلئے دوڑ دھوپ شروع کردی۔ جیسے ہی ان کے رشتے پکے ہوگئے۔ یکے بعد دیگرے شکیلہ اور عقیلہ کی ذمہ داری سے بھی فراغت حاصل کرلی۔

جمیلہ خاتون نے طیارے کی کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن باہر سوائے دھندلی فضا کے انھیں کچھ نظر نہیں آیا۔ ایک سرد سی آہ بھر کر انھوں نے پیچھے سر ٹکا دیا اور پھر سے یادوں میں کھو گئیں۔

ارشد نے بہنوں کی شادی کے لئے خاصی رقم روانہ کی تھی۔ احمد صاحب بڑے خوش تھے۔ لیکن یہ خوشی زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکی۔ ایک دن اچانک ان کے قلب پر حملہ ہوا اور وہ گزر گئے۔

جمیلہ خاتون کی ساری دنیا تہہ و بالا ہوگئی۔ زندگی بے مقصد اور ویران نظر آنے لگی۔ اس وقت اگر اکرم اور اس کی بیوی نے ان کا خیال نہ رکھا ہوتا تو وہ بالکل ہی ڈھے جاتیں۔ ارشد اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کی بنا پر آ نہیں سکتا تھا ویسے وہ ٹیلی فون سے بات ضرور کرلیا کرتا تھا۔ ایک دو بار کچھ رقم بھی بھیجی تھی۔

جمیلہ خاتون کو ارشد کی یاد ستانے لگی انھوں نے کئی بار ٹیلی فون پر اصرار کیا کہ ارشد اپنی بیوی اور دونوں لڑکوں کے ساتھ کچھ دن کیلئے حیدرآباد آجائے۔ ویسے بھی اسے امریکہ گئے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا لیکن ارشد نے اپنی ملازمت کی مجبوریوں کی بنا پر آنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ البتہ اس نے اصرار کیا کہ جمیلہ خاتون ہی کچھ دنوں کیلئے امریکہ آجائیں۔ وہ انتظام کردے گا۔ جمیلہ خاتون تو حیدرآباد سے باہر جانے کے لئے تیار ہی نہ تھیں لیکن اکرم نے کہا کہ امریکہ میں کچھ دن گزار کر وہ یہاں کے ماحول سے چھٹکارا پاسکیں گی۔ مجبوراً انھوں نے امریکہ جانے کیلئے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اکرم نے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کارروائی شروع کردی۔ پاسپورٹ کے بعد ویزا کا معاملہ درپیش ہوا۔ ارشد نے اس بارے میں بڑی تیزی دکھائی۔ اس کی زبردست کوششوں کی بنا پر ویزا مل ہی گیا اور ایک دن وہ امریکہ چلی آئیں۔

اچانک ایر ہوسٹس مٹکتی ہوئی آئی اور اس نے بڑے اخلاق سے جمیلہ خاتون سے پوچھا کہ

انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ ان کے انکار کو سن کر وہ سر ہلاتی چلی گئی۔

ایر پورٹ پر ارشد، اس کی بیوی فہمیدہ اور ان کے دونوں لڑکے اس کے استقبال کیلئے آئے تھے۔ فہمیدہ کو دیکھ کر جمیلہ خاتون دنگ رہ گئیں۔ کاندھوں تک کٹے ہوئے بال، زبردست میک اپ، آنکھوں پر گاگلز اور لباس میں ایک خاص اہتمام۔ وہ واقعی خوبصورت تھی۔ دونوں لڑکے بھی بڑے اسمارٹ تھے لیکن کچھ کھنچے کھنچے سے۔

شاندار کار میں ان سب کے ساتھ ارشد کے مکان جاتے جاتے انھوں نے ارشد کو غور سے دیکھا۔ وہ کافی بدل چکا تھا۔ رنگ خاصا نکھر گیا تھا۔ تھوڑی سی توند نکل آئی تھی لیکن اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا وقار نظر آتا تھا۔ ارشد نے کار چلاتے ہوئے بھائی بہنوں اور ان کے بچوں کے بارے میں پوچھا۔ کئی اور رشتے داروں کو یاد کیا۔ فضا میں ایک عجیب سے ٹھنڈک تھی۔ کاروں کی قطاروں اور صاف ستھری سڑکوں کو وہ حیرت سے دیکھتی رہیں۔ کہیں گرد و غبار کا نام نہیں تھا اور نہ شور شرابا۔ یہاں سب کچھ کتنا منظم تھا۔ جلد ہی کار ارشد کے مکان پر پہنچ گئی۔ مکان کیا تھا؟ ایک خوبصورت بنگلہ تھا۔ سامنے ہری دوب والا لان تھا۔ خوشنما پودے تھے۔ اندر مکان میں آرام و آسائش کی ایسی ایسی چیزیں تھیں کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جائے! واقعی یہاں رہنے والے، دنیا کے سب سے خوش نصیب لوگ ہیں!

لیکن جمیلہ خاتون کو جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں ہر سرگرمی کے پیچھے سخت محنت چھپی ہوئی تھی۔ نوکر نہیں تھے زیادہ تر کام گھر والوں کو خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ ارشد ایک ایسے ذمہ دار عہدہ پر کام کر رہا تھا کہ وہ صبح جو آفس جاتا تو رات دیر گئے واپس لوٹتا۔ فہمیدہ، صبح اٹھ کر بچوں کو اسکول بھیجنے کی تیاری میں لگ جاتی۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ شاپنگ کیلئے نکل جاتی اور دوپہر ڈھلے واپس آتی۔ پھر کھانا پکانا شروع ہوتا۔ پھیکا پھیکا اور زیادہ تر ڈبوں سے نکال کر پکایا ہوا۔ لیکن آہستہ آہستہ انھیں عادی ہونا ہی پڑا۔ ٹیلی ویژن، دوپہر سے رات تک چلتا ہی رہتا۔ وہ اس دوران عبادت میں مشغول رہتیں۔ پھر انھوں نے فہمیدہ کا، کچن میں ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ وہ کچن کے سارے ساز و سامان سے اچھی طرح واقف ہو گئیں۔ پہلی بار انھوں

نے جب بگھارے بیگن کا سالن بنایا تو رات ارشد اپنی انگلیاں چاٹتے رہ گیا۔ پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ کھانا پکانا انہی کی ذمہ داری ہوگیا۔ فہمیدہ کا سلوک ان سے بہت اچھا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس میں تبدیلی آتی گئی۔ وہ بچوں کے اسکول جانے کے بعد کچن میں آتی اور ہدایتیں دے کر چلی جاتی۔ ناشتے کے بعد حسب معمول باہر چلی جاتی۔ پھر جائے دوپہر واپس گھر لوٹ آنے کے وہ زیادہ دیر باہر وقت گزارنے لگی۔ جمیلہ خاتون پوچھتیں تو ترشی سے جواب دیتی کہ اسے بینک کے کام دیکھنے پڑتے ہیں اور دوسرے کام بھی۔ اس کی سہیلیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ بھی آدھمکتیں لڑکے اسکول سے آتے تو کھیلنے کیلئے چلے جاتے۔ پھر آ کر ٹی وی دیکھتے' اسکول کا ہوم ورک کرتے اور سو جاتے۔ انھیں آہستہ آہستہ یہ بھی پتہ چلا کہ ارشد سے فہمیدہ کا سلوک بھی ٹھیک نہیں ہے وہ اس کا خیال برابر نہیں رکھتی تھی۔ ایک بار رات دیر گئے ان دونوں میں جھگڑا بھی ہوا۔ صبح میں جب انھوں نے ارشد سے اس بارے میں پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے ٹال دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ارشد بھی زیادہ سے زیادہ وقت اب باہر ہی گزارنے لگا ہے۔ گھر کا سارا انتظام اب جمیلہ خاتون کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔ وہ مسلسل کام میں لگی رہتیں۔ ان کی بہو ان سے صرف کام کی بات کیا کرتی۔ بچے اپنے ہی دھرے پر چلتے رہتے۔ کچھ عرصے بعد جمیلہ خاتون کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اس گھر میں ان کا دم گھٹنے لگا ہے۔ وہ محض کام کرنے کی مشین بن کر رہ گئی تھیں۔ کام سے انھوں نے کبھی منہ نہیں موڑا تھا لیکن آہستہ آہستہ ان کے قویٰ جواب دیتے جا رہے تھے۔ جسم ٹوٹنے لگتا تو کوئی ان کی خبر تک نہیں لیتا تھا۔ وہ کیسی ہیں؟ یہ پوچھنے کا کسی کے ہاں وقت نہیں تھا۔ ارشد سے بھی ہفتوں بات نہیں ہوتی تھی۔ ایک دو بار انھوں نے گھر کے کام کا ذکر کیا تو فہمیدہ نے انھیں جھڑک دیا تھا۔ تبھی انھیں پورا یقین ہوگیا تھا کہ کسی کو ان کی پروا نہیں ہے۔ کوئی ان کا حال پوچھنے اور بات کرنے کا روادار نہیں ہے۔ ان کی حالت ایک ایسی نوکرانی جیسی ہوگئی ہے جسے رہنے کی جگہ اور کھانے پینے کے عوض کام کرنے کیلئے رکھا گیا ہے!

ایک رات جب ارشد حسب معمول دیر سے گھر واپس آیا تو انھوں نے اس کے کمرے کا

دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی بہو نے دروازہ کھولا اور ترشی پوچھا کیا ہے؟

''مجھے ارشد سے بات کرنی ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''یہ کوئی بات کرنے کا وقت ہے؟ صبح کر لینا''

اتنے میں ارشد دروازے پر آیا۔ ان کی بہو کمرے میں چلی گئی۔

ارشد نے پوچھا ''کیا بات ہے' ماں''

جمیلہ خاتون نے رکتے رکتے کہا۔ ''میں انڈیا واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''کیوں ماں؟ کیا تکلیف ہے آپ کو یہاں۔''

''کوئی تکلیف نہیں'' انھوں نے جواب دیا ''میں بس' مجھے انڈیا کی یاد آرہی ہے۔''

اتنے میں ان کی بہو وہاں آگئی۔ کیا کریں گی ہندوستان جا کر؟ وہاں کے لوگوں کی غلامی؟ یہاں شاہانہ انداز سے رہنا آپ کو پسند نہیں؟ وہیں رینگتے رینگتے زندگی گزارنا چاہتی ہیں؟

جمیلہ خاتون کو ارشد کی خاموشی پر گہرا صدمہ پہنچا۔ انھوں نے کہا۔ ''تم کو یہ سب کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں جلد از جلد انڈیا جاؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے!''

اگلے کئی دن گھر میں بڑی کشیدگی رہی۔ بہو نے تو ان سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ارشد نے البتہ ایک بار کہا کہ وہ ان کی واپسی کا انتظام کر رہا ہے۔

پھر آخر وہ دن آگیا جب انھیں واپس جانا تھا۔ صبح ہی سے ان کا دل بھر آرہا تھا۔ وہ بار بار اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اپنا سامان باندھتی رہیں۔ جب جانے لگیں تو ارشد کے دونوں لڑکے ان کے قریب تک نہیں آئے۔ بہو تو کمرا بند کر کے بیٹھ رہی۔ انھوں نے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ ارشد اپنے کمرے سے باہر آیا اور ان کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت سا باکس دے دیا۔ یہ کیا ہے؟ انھوں نے پوچھا ''یہ ایک نیکلس ہے۔ آپ کے لئے۔'' اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور فہمیدہ دندناتے ہوئے باہر آئی۔ ''یہ' ماں کو تحفہ دیا جا رہا ہے؟ اس فضول خرچی کی کوئی ضرورت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جمیلہ خاتون کے ہاتھ سے باکس اچک لیا اور اندر چلی گئی۔

جمیلہ خاتون ہکی بکی رہ گئیں اور حیرت یہ تھی کہ ارشد بھی خاموش رہا۔ ایرپورٹ تک راستے

میں دونوں خاموش رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں ماں بیٹے کے بیچ اب کچھ کہنے سننے کیلئے باقی نہیں رہ گیا ہے!

ایر پورٹ میں چیک ان (Check-in) کے وقت ارشد نے بھرائی ہوئی آواز میں صرف یہ کہا۔

''ماں! مجھے معاف کر دینا۔'' اور وہ چلا گیا۔

جمیلہ خاتون نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ طیارہ لندن کی ہیتھ رو ایر پورٹ پر اترنے ہی والا تھا چند اور گھنٹوں کے بعد وہ ہندوستان پہنچ ہی جائیں گی۔ جہاں بھوک ہے' غریبی ہے لیکن اپنوں کا بے پناہ پیار بھی ہے۔ جہاں اکرم ہے' اس کی جان چھڑکنے والی بیوی ہے اور ان سے محبت کرنے والے اس کے بچے ہیں۔ جہاں ان کے شوہر اور خاندان کے دوسرے افراد مٹی میں دفن ہیں۔ اپنے ہی وطن کی مٹی میں...... اب ان کے لئے دنیا تنگ نہیں رہے گی!

فردوسِ گمشدہ

مجیب نے کال بیل پر انگلی رکھی اور کہیں دور اس کی آواز گونجتی رہی۔ پتہ نہیں کتنے منٹ گزر گئے۔ جھنجھلا کر اس نے پھر سے کال بیل دبائی۔ کچھ دیر بعد ایک چاپ سنائی دی۔ پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک بدصورت عورت تھی۔

'اشرف صاحب ہیں ......''اس نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔ وہ بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی بیگم صاحبہ ہیں آپ کہیں تو......''

''نہیں نہیں!'' مجیب جلدی سے بول پڑا۔ ''میں ......دراصل ......'ٹھہریئے'' یہ کہہ کر نوکرانی اندر چلی گئی۔ لاحول ولا قوۃ! یہ کیا مصیبت ہے؟ میں بھلا مسز اشرف سے مل کر کیا کروں گا۔ اشرف ملتا تو بات بھی تھی! کم بخت کو ابھی بنگلور جانا تھا اور وہ اسنہا؟ وہ بھی اپنے سسر کا ماتم منانے کہیں گیا ہوا تھا۔

'' آیئے۔ آپ کو وہ ڈرائنگ روم میں بلا رہی ہیں۔ وہ چڑیل بولی۔ وہ اس کی سات پشتوں کو گالی دیتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا۔

ڈرائنگ روم میں ایک خاتون' آسمانی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے کھڑی تھیں۔ موٹی موٹی خوابیدہ سی آنکھیں' سیٹ کئے ہوئے بال۔ اور مسکرانے کی ہلکی سی کوشش کرتے ہوئے سرخ ہونٹ۔ تعجب یہ تھا کہ اس حالت میں بھی اس کی جمالیاتی حس باقی تھی!

'' آداب عرض ہے''

'' آداب......آپ اشرف صاحب سے ملنے آئے تھے؟''۔''جی!'' اس نے کسی قدر ترشی سے جواب دیا۔

''وہ بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ پھر وہاں سے شاید کانجی ورم بھی جائیں کیونکہ انہیں کچھ آرڈر پلیس (place) کرنے ہیں......''

''اچھا......تو پھر مجھے اجازت دیں اس نے فوراً کہا ''ارے! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تشریف

رکھئے ...... بتایئے ...... آپ کیا پیئں گے؟'

''صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی ......'' اس نے کہا'' کمال کرتے ہیں آپ بھی ...... میں نے اشرف صاحب سے کئی بار آپ کا ذکر سنا ہے۔ سلیمہ بی! جوس لے آؤ''

جوس کی ایسی تیسی! اس کے پیٹ میں تو' تنور کھلا ہوا تھا ...... اور وہ آگ' ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی ......

''آپ کی مرضی'' ...... اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن ہونٹ جیسے منجمد ہو کر رہ گئے۔ وہ بیٹھ گیا۔

''اشرف صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں ...... آپ کی علمیت آپ کی خودداری ...... آپ کے اصولوں کی ......''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے؟ پھر بھی' اس نے کہا ...... ''سب عنایت ہے ان کی ......''

''آپ آج کل کرتے کیا ہیں؟'' خاتون نے کہا۔

اسی وقت نوکرانی جوس لے کر آ گی ......

''لیجئے!''

مجیب نے جوس کا گھونٹ بھرا۔ خالی پیٹ میں آگ اور بھڑک اٹھی ...... ''فلسفے سے ایم۔ اے کرنے کی سزا بھگت رہا ہوں ...... ٹیوشن کر لیتا ہوں ......''

خاتون نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''تعجب ہے! آپ جیسا قابل آدمی ......''

''اچھا تو اب اجازت دیجئے ......'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ''بیٹھئے نا'' خاتون نے کہا۔

''جی نہیں! مجھے کہیں اور بھی جانا ہے''۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں آیا کہ دل کی بات کہہ دے۔ کچھ روپے مانگ لے۔ لیکن اس کے اندر کا ہائی برو (High Brow) احتجاج کر اٹھا۔ اپنے آپ کو اس قدر گرا دو گے؟ بھوکے پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے خودداری کا سودا کرو گے؟

''ٹھیک ہے! آپ اطمینان رکھیں میں اشرف صاحب سے کہہ دوں گی ......'' خاتون نے کہا۔

وہ سر ہلاتا باہر آ گیا۔ اب کون سا در باقی رہ گیا ہے؟ کچھ روپوں کے لے کئی دوستوں کے در پر دست سوال دراز کرنے گئے تھے اور کہیں بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ چلو! اب گھر ہی

چلتے ہیں۔

مجیب تھکے تھکے قدموں سے اپنے مکان کی جانب چلنے لگا۔ خالی پیٹ پر جوس نے آگ پر تیل کا کام کیا تھا۔ ہاتھوں اور پاؤں سے جیسے کسی نامعلوم طاقت نے ساری توانائی نچوڑ لی تھی۔ وہ پچھلے دو روز سے بھوکا تھا۔ چلتے چلتے اس کی آنکوں کے آگ سیاہ پیوند سے آجاتے۔ اس کے زرخیز دماغ نے کچھ سوچنے کی صلاحیت ہی گنوادی تھی۔

کیسی بے تکی زندگی تھی اس کی؟ بچپن...... ایک دھندلا' کہیں کہیں خوشگوار سا خواب۔ اس کی زندگی کی پہلی محبت تھی...... کتابیں...... جنھیں وہ پیسہ پیسہ جوڑ کر پڑھا کرتا تھا۔ جو خرید نہیں سکتا تھا انھیں لائبریری میں جا کر پڑھ لیتا۔

وہ متوسط طبقے کا ایک چھوٹا سا گھرانہ۔ اس کا وہ سخت گیر باپ' مشفق ماں اور جی جان سے چاہنے والی بڑی بہن...... ایک کا بھی تو سہارا' اب اسے نصیب نہیں...... سبھی گزر گئے...... رہ گیا وہ...... اکیلا...... بے روزگار...... اور بھوکا......

طالب علمی کا اختتام ایک ڈگری پر ہوا تھا وہ خوش تھا کہ اب اسے ٹیوشن نہیں کرنے پڑیں گے۔ کلرکی نہیں کرنی پڑے گی لیکن کچھ عرصے میں ہی اسے پتہ چل گیا کہ فلسفے کی اس کی ڈگری کا' روزگار کے بازار میں کوئی مول نہیں ہے...... لکچرر کا عہدہ اسے مل نہیں سکا...... سرکاری نوکری کیلئے کوشش اس نے نہیں کی...... بس پیٹ پالنے کیلئے ٹیوشن ہی کی کمائی پر انحصار کرتا رہا۔ ایک عرصے سے وہ یہی کام کر رہا تھا۔

اب کی بار جب گرمیاں آئیں تو وہ بے کار ہو گیا۔ جو کچھ جمع جتھا تا اس پر گزارا کرتا رہا۔ پچھلے دو دن سے وہ بھوکا تھا۔ دوستوں سے قرض بھی اسے مل نہ سکا چلو! گھر ہی چلتے ہیں!

گھر؟ اس کا گھر کیا تھا؟ ایک کمرہ...... جس میں اس کی ساری کائنات تھی...... ایک بستر' کونے میں کچھ برتن اور ڈھیر ساری کتابیں...... کیا مقدر دیا ہے مالک نے؟ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ پیٹ کی آگ کچھ اور بھڑکی...... یا خدا! وہ کیا کرے؟ کیسے اس دوزخ کو ٹھنڈا کرے؟ کیسے؟

اس نے اپنے کمرے کا قفل کھولا۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ کیا اس کے ہاں کوئی ایسی چیز ہے جسے بیچ کر وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکے؟ کپڑے؟ وہ تھے

ہی کتنے۔ برتن؟ بس استعمال کئے جانے والے ہی تھے! ایک چولھا۔ چند رکابیاں اور پیالیاں
آخر' کونسی چیز بیچی جاسکتی ہے؟ اچانک اس کی نظر اپنی کتابوں پر پڑی...... یہ کتابیں' اس کی دیرینہ رفیق تھیں۔ ایک ایک کتاب اس کے سکھ اور دکھ کی ساتھی تھی۔ اس کی راز دار تھی...... اس کی رہبر تھی...... کیا وہ......؟

نہیں! لیکن...... اس کا زندہ رہنا بھی ضروری تھا...... جب پڑھنے والا ہی نہیں ہوگا تو انھیں پڑھے گا کون؟ وہ جلدی سے اٹھا اور اس نے کتابوں کو چن چن کر یکجا کرنا شروع کیا...... یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ اب وہ کسی بھی کام سے پیچھے نہ ہٹے گا۔ کوئی بھی کام' جس سے اس کا پیٹ بھر سکے۔ اصول اور آدرش' صرف پیٹ بھرے لوگوں کے لئے ہیں۔ اس جیسے افراد کے آگے ایک ہی راستہ ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانا۔

اس نے پھر سے کتابیں اٹھانی شروع کردیں۔ ''ٹھہرو'' کہیں سے آواز آئی۔ وہ رک گیا...... یہ ملٹن (Milton) کی آواز تھی...... ''ایک اچھی کتاب' کسی بھی عظیم آدمی کی زندگی ہوتی ہے......'' ہونہہ! وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ یہاں عظیم آدمی ہے ہی کون......؟ ''رک جاؤ......'' ایک اور آواز آئی...... یہ کارلائیل تھا...... ''کیا تمھیں یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا تھا......؟ میں نے کہا تھا کہ خدائے برتر ان لوگوں پر رحمتوں کی بارش کرے' جنھوں نے کتابیں ایجاد کیں۔''
پھر کوئی اور چیخا...... یہ بلاک (Bellac) تھا۔

''کیا تم بھول گئے کہ میں نے تمنا کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد بھی کتابیں پڑھی جائیں؟ چاہے میرے گناہوں کو کتنا ہی اچھالا کیوں نہ جائے......''

''چپ رہو تم سب'' مجیب نے چلا کر کہا ''تمھیں کچھ کہنے کا کوئی حق نہیں! تم کون ہوتے ہو' مجھے روکنے والے؟ تم نے مجھے دیا ہی کیا ہے؟ میں نے تمھارے لیے دن کا چین اور راتوں کی نیند کھوئی۔ میں نے تمھیں اپنی ماں' باپ' بہن سب کچھ سمجھا۔ میں نے اپنے زخموں کا مرہم' تم میں تلاش کرنے کی کوششیں کی۔ میں نے اپنے دل و دماغ کی گرہیں کھولنے کیلئے تمھاری رہنمائی حاصل کی۔ لیکن...... لیکن' تم نے مجھے کیا دیا؟ مفلسی' بھوک اور جھوٹی انا؟ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں میں ان پڑھ ہی رہتا تو کچھ کما کر جی لیتا...... تم سب نے مجھے کہیں کا نہ رکھا......' وہ چیختا ہی رہا......

پھر ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے' اس نے سبھی کتابوں کی گٹھری بنائی ...... باہر نکل کر، کمرے کو قفل لگایا...... اور قریب سے گزرتے ہوئے رکشا میں بیٹھ کر اسے قریب کے کتابوں کے بازار میں چلنے کیلئے کہا۔ راستہ بھر اس کا دماغ پیٹ کے اندر کنویں میں پڑا ہاتھ پیر مارتا رہا!

پرانی کتابوں کا سودا ہی کیا ہے؟ لیکن کچھ روپے تو بہر حال ہاتھ آ ہی گئے۔ اس نے رکشا والے کو کرایہ دے کر چلتا کیا۔ پھر قریب کی ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ ہوٹل تک کا راستہ اسے بے حد طویل لگا۔ پتہ نہیں ہوٹل میں ایک خالی میز پر بیٹھتے ہی اس نے کن چیزوں کا آرڈر دیا لیکن کچھ دیر بعد بیرا جو کچھ لے آیا وہ اس پر ٹوٹ پڑا اسے اس طرح کھاتے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مجیب ہے' جس کا سلیقہ اور رکھ رکھاؤ دوستوں میں مسلمہ تھا...... بھوک انسانی جسم کا تقاضہ بھی ہے!

پیٹ بھر کر کھانے کے بعد اس نے سرور کے عالم میں چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ قریب کی میز پر دو آدمی بحث میں مشغول تھے وہ بیرے کو چائے کا آرڈر دینے ہی والا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں کچھ الفاظ ٹکرائے ...... ''ملٹن کی فردوس گمشدہ تو......'' باقی الفاظ کسی بیرے کی اونچی آواز تلے ڈوب گئے۔ ایسا لگا جیسے اس کے دل میں کوئی تیر چبھ گیا...... اس نے ایک بار، آہستہ سے دہرایا......

''فردوسِ گمشدہ......''

دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے!

☆☆☆

یہ سادہ دل بندے

جیسے جیسے دن چڑھتا جا رہا تھا جمن کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آج صبح سے کسی کام میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے خود کو ہزار طرح سے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر تھوڑی دیر سے اس کا ذہن انجانی سی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا اور وہ فیصلہ نہ کر پاتا کہ اسے کیا کرنا ہے؟

صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد جب وہ مسجد سے باہر نکل رہا تھا تو سب لوگوں کو اسے اتنی جلدی مسجد سے نکلتا دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ وہ اس وقت تک مسجد سے باہر نہیں نکلتا تھا جب تک سو مرتبہ درود شریف نہ پڑھ لے۔ اس کے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آتا تھا حتیٰ کہ اس دن بھی نہیں جب کہ اس کی لڑکی کی شادی ہو رہی تھی۔ اس روز گاؤں ے لوگ بڑے ہی جوش و خروش سے جمن کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک بھی اس کی خوشی میں شریک تھے۔ صبح سورج نکلنے کے وقت انھیں باراتیوں کا استقبال کرنا تھا۔ گاؤں کی نیک نامی کی بات تھی۔ پھر دولھا کوئی ایسا ویسا تو تھا نہیں ...... اچھا ...... خاصا ...... دس جماعتوں تک پڑھا ہوا۔ وارث پور کے ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ۔

لیکن اس روز بھی جمن نے اپنا معمول نہیں چھوڑا تھا۔ راحت خان نے کہا بھی ''بھئی جمن! چھوڑو بھی آج یہ وظیفہ...... ایک دن چھوڑ دینے سے کیا اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے......؟'' لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

شیخ جمن کبھی تحصیل میں چپراسی تھا۔ اور اس کی سادہ لوحی اور نیک دلی کے چرچے ساری تحصیل میں عام تھے۔ تحصیل دار صاحب کو اس پر بڑا اعتماد تھا۔ اور وہ اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ تحصیل کی ہنگامہ خیز زندگی میں جہاں رشوت کی نہریں بہا کرتی تھیں اور نیچے سے اوپر تک لوگ ان نہروں میں ہاتھ دھونا اپنا فرض سمجھتے تھے، جمن اپنی ایمانداری سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹتا تھا۔ اس کے ساتھ مذاق کرتے۔ ''ارے میاں جمن۔ تم نے ایک عمر گزار دی، مگر رہے بدھو کے

بدھو...... ابھی ہوش میں آ جانے کا موقع ہے بڑھاپے کے لئے کچھ سامان کر لو۔"

"ابے چپ......" جمن انہیں ڈانٹتا "ٹرٹر کیے جا رہا ہے بیٹا۔ حرام کی کمائی کب تک کھاؤ گے......؟ ایک نہ ایک دن تو گردن پھنسے گی۔ پھر سڑکوں کی دھول پھانکو گے۔ جانتے ہو خدا کیا کہتا ہے رشوت کے بارے میں؟" ایک لخت اس کے چہرے پر ایک عجیب سے نرماہٹ دوڑ جاتی اور اس کی آنکھیں دور خلاء میں گھورنے لگیں۔ "وہ فرماتا ہے۔"

"بس کرو بابا بس کرو......!" ایک چپراسی اس کی بات اچانک کاٹ دیتا "تم تو وعظ کرنے ہی بیٹھ جاتے ہو۔ شوق سے مت کھاؤ تم رشوت مگر ہمارا جینا کیوں حرام کرتے ہو۔" اور سب ہنسنے لگتے۔

گاؤں کے سبھی لوگ اس کی خوبیوں کے بڑے معترف تھے اور اپنے گھریلو معاملات میں اس سے صلاح کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ گاؤں کا کوئی بیاہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں جمن شریک نہ ہوتا ہو۔ جب بھی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی بیاہ ہوتا اور نکاح کے بعد قاضی صاحب جلدی سے اپنے بڑے سے رومال میں بادام اور کھانڈ کا ڈھیر باندھے تشریف لے جاتے تو جمن دولہا کو نکاح کی اہمیت سمجھاتا۔ اس کے حقوق اور فرائض کا تذکرہ کرتا اور بتاتا کہ ایک سے دو ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

جب بھی کسی کے ہاں اولاد ہوتی اسی کو بلایا جاتا۔ بچے کے کان میں اذان دینے کے لیے اور جب یہی بچے بڑے ہو جاتے تو جمن انھیں صبح میں قرآن پڑھایا کرتا تھا اور پڑھانے کے دوران انہیں بتلاتا کہ وہ کب پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ماں باپ اس وقت کیسے تھے۔ اور پھر یہ بھی کہ ان کے کانوں میں سب سے پہلے اسی نے اذان دی تھی۔ اور بچے حیرت سے منہ کھولے یہ سب سنتے رہتے۔ جمن کی اذان کی دور دور تک دھوم تھی۔ صبح فجر کے وقت جب اس کی تھرتھراتی پرسوز آواز رات کے دھندلکے کو چیرتی ہوئی گاؤں میں گونجتی تو گنہگاروں کے دل بھی کانپ اٹھتے۔ اس وقت مسجد میں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اذان دینے کے بعد وہ اپنے سر پر گھڑا اٹھائے قریب کے کنویں سے پانی بھر لاتا اور مسجد کے بڑے سے تسلے کو بھر دیتا تاکہ نمازیوں کو وضو کرنے کے لئے کنویں پر نہ جانا پڑے۔ اس کے بعد وہ اپنی لاٹھی اٹھاتا اور گاؤں کی گلیوں کا راستہ لیتا۔ ہر گھر پر رکتا اور دھیرے سے آواز دیتا۔ "نماز نیند سے بہتر ہے......"

جمن کی بیوی کا اس کی جوانی ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی اکلوتی لڑکی ہی اس کی زندگی کا سہارا تھی۔ اس لڑکی کو وہ جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس نے اس کا قرآن ختم کروایا۔ اور پھر اس کے لئے رشتے تلاش کرنے لگا۔ قسمت سے رشتہ بھی ایک شریف خاندان ہی میں طے ہو گیا۔ جمن کو جیسے گھر بیٹھے دولت مل گئی۔ پہروں وہ گاؤں والوں کے سامنے اپنے داماد کے گھرانے کا تذکرہ کیا کرتا۔ اس کا داماد بھی اس کا بڑا خیال کرتا تھا۔ بیٹی داماد نے اسے بہت مجبور کیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر ان کے ساتھ شہر میں رہا کرے لیکن وہ راضی نہ ہوا تھا۔ ''بیٹی اپنی ہو تو ہو بیٹی کا گھر اپنا نہیں ہوتا۔'' وہ اکثر گاؤں والوں سے کہا کرتا تھا۔

ہفتے میں ایک بار بیٹی کے گھر بڑے اہتمام سے پہنچ جاتا۔ ساتھ میں کچھ پھل ہوتے' کچھ گھی ہوتا اور گاؤں کا بنا ہوا تھوڑا سا اچار بھی کیوں کہ اس کے داماد کو اچار بہت پسند تھا۔ یہ سب کچھ لے کر جب وہ لدا پھندا پہنچتا تو خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی اور اس کا نواسا دوڑ کر اس کی گود میں چڑھ جاتا اس کے ہاتھ سے تھیلی جھپٹ لیتا۔ تب جمن کو ایسا محسوس ہوتا جیسے دنیا ہی میں اسے جنت مل گئی ہو۔ اپنے چہیتوں کا خلوص' دل کے گوشوں کو کتنا منور کر دیتا ہے۔

لیکن آج جیسے اس کے دل میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اس کی قوت فیصلہ جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اور دماغ کسی کند چھرے کی طرح زنگ آلود ہو چلا تھا۔ آخر اس کیفیت کی وجہ کیا تھی؟

گاؤں کی مسجد میں جہاں گاؤں کے سبھی مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے۔ بہت قدیم تھی۔ شاید قلی قطب شاہ کے زمانے کی دیواروں میں جگہ جگہ شگاف پڑ چلے تھے۔ کہیں کہیں کسی بوڑھے کے دانتوں کی طرح چونا جھڑتا جا رہا تھا اور کئی بار تو نماز کے دوران نمازیوں کے سر پر ڈھیلے گر پڑے تھے۔ مسجد کا اوپری حصہ بھی تمام کا تمام کائی کی چادر اوڑھے تھا اور میناروں کے اوپری سرے موسموں کے پے در پے حملے برداشت نہ کر کے ٹوٹ چکے تھے۔ سیاہی تقریباً پوری مسجد پر غالب تھی۔ فرش پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے جن میں برسات کے دنوں میں اوپر کا پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہو جاتا اور جانمازیں ہٹاتے ہٹاتے نمازیوں کے گھٹنے دکھنے لگتے۔

مسجد کی اس حالت کا جمن کو بڑا دکھ تھا۔ اس کا بس چلتا تو صرف اپنے ہی صرفے سے ساری مسجد کو آئینہ بنا دیتا۔ جب بھی وہ گاؤں کے کسی مسلمان سے ملتا تو گفتگو کے دوران مسجد کی خستہ حالی کا ذکر ضرور لے آتا۔ لوگ ہنستے اور کھسک جاتے کہ یہاں دو وقت پیٹ بھرنا ہی بھاری

ہے۔ پہلے گھر میں چراغ تو پھر مسجد میں۔

لیکن اس دن فجر کے بعد جمن نے کچھ اس انداز سے مسجد کی کسمپرسی کا ذکر چھیڑا کہ لوگوں کے دل پگھل گئے۔ یہ شاید اس کے لہجے کا والہانہ خلوص تھا جو سننے والوں کے جذبہ ایمان پرستی پر صیقل کر گیا۔ آن کی آن میں لوگوں نے وعدہ کرلیا کہ وہ حتی الامکان مسجد کی ترمیم کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے۔ اور واقعی ایک ہفتہ کے اندر اندر دو ہزار روپیوں کی خطیر رقم جمع ہو ہی گئی۔ جمن ایسے خوش تھا کہ جیسے اسے جنت کی کنجی مل گئی ہو۔ یہ سوچ سوچ کر اس کا دل قابو سے باہر ہو جاتا تھا کہ مرمت کا یہ مبارک کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اسے دراصل پوری طرح اب محسوس ہوا کہ گاؤں کے لوگ اس پر کتنا اعتماد کرتے ہیں لیکن اسی اثنا میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے اس کا سکون چھین لیا۔

ہوا یہ کہ ایک دن جب وہ حسب معمول اتوار کو اپنی لڑکی کے ہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹی اور داماد بڑے پریشان ہیں۔

''کیوں خیریت تو ہے؟'' اس نے پسینہ پیشانی سے پونچھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''قاسم کہاں ہے؟' قاسم اس کے نواسے کا نام تھا۔'' ''سو گیا ہے۔'' اس کی بیٹی نے جواب دیا۔ ''تم لوگ پریشان کیوں ہو۔'' اس نے بوریے پر بیٹھ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... ذرا'' اس کے داماد نے منہ کھولا۔ ''ذرا الجھن آپڑی تھی۔''

''کیسی الجھن؟''

اس کے داماد نے ایک لمحے کے لیے اس کی بیٹی کی طرف دیکھا' جیسے پوچھ رہا ہو کہوں یا نہ کہوں پھر کھنکھار کر بولا۔ ''ہمارے محکمے کی طرف سے کچھ روز پہلے یہ آرڈر جاری ہوا ہے کہ ہر صیغہ حساب کے اہل کار کو دو ہزار روپیوں کی ضمانت ایک ہفتے کے اندر داخل کرنی ہوگی ورنہ انہیں نکال دیا جائے گا۔ وہ رک گیا۔ پھر بولا۔ ''وقت اتنا کم ہے کہ شاید ہی کہیں سے انتظام ہو سکے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟'' واقعی بڑی الجھن ہے؟ جمن بولا اور سوچنے لگا۔ کیا کیا جا سکتا ہے؟ اس کے داماد نے شادی کے بعد سے اب تک کوئی فرمائش اور کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ پھر اس کا کوئی قریبی رشتہ دار بھی تو نہیں تھا کہ ایسے وقت اس کی مدد کو آگے آتا۔ کیا وہ کچھ نہیں کر سکتا اپنے داماد اور بیٹی کے لیے......؟ یہ ان کی خوش حالی کا سوال تھا۔ نوکریاں آج کل

آسانی سے نہیں مل جایا کرتیں۔ بڑے جوتے گھستے ہیں۔ زمین اور آسمان ایک کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر نوکری لگتی ہے۔ اب یہ نوکری چھوٹ جائے تو پتہ نہیں کیسی کیسی مشکلیں برداشت کرنی پڑیں گی انھیں۔

کیا کسی طرح وہ ان کی مدد نہیں کر سکتا؟ شاید گاؤں والوں میں سے کوئی دے سکے......؟ نہیں......اس کے دل نے فوری تردید کی۔ وہاں تو سبھی فاقہ مست تھے۔ انھیں اپنا نباہ کرنا ہی کٹھن تھا۔ پھر کیا ہوگا۔ کیا وہ انھیں فاقوں کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتا ہے۔ کیا وہ ان کی چھوٹی سی خوشگوار دنیا کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کیا کچھ بھی نہیں؟

''بھئی ایک صورت ہو سکتی ہے۔'' وہ بول اٹھا۔

''کیا؟'' بیٹی اور داماد دونوں ہی ایک ساتھ پوچھ بیٹھے۔

''میرے پاس مسجد کی مرمت کے لیے کچھ گاؤں والوں کے روپے جمع ہیں۔ یہی کوئی دو ہزار روپے۔'' وہ رک گیا۔ جیسے کسی نے دل کے کسی گوشے سے کہا۔ ''تم کیا کر رہے ہو؟'' اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ ''میں تمھیں وہ دے سکتا ہوں لیکن تمھیں وہ جلد ہی واپس کرنے ہوں گے۔ مسجد کی امانت ہے۔ لوگ کسی وقت بھی روپیہ مانگ سکتے ہیں۔''

''بس ماموں ایک ہفتے کی مہلت دیجئے'' اس کے داماد کے لہجے میں خوشی تھی۔ ''میں کہیں نہ کہیں سے انتظام کر ہی لوں گا۔ آپ کے روپیوں کی واپسی کا۔''

پھر جمن نے دو ہزار روپے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنے داماد کے حوالے کر دیئے اس نے یقیناً امانت میں خیانت نہیں کی تھی۔ کسی کے کام آنا ثواب ہے۔ اور پھر اس کا داماد تو جلد ہی رقم واپس کر دے گا۔

لیکن دن گزر گئے لیکن رقم واپس نہ آئی۔ ہفتہ ختم ہوا۔ دوسرا۔ تیسرا۔ چوتھا۔ پھر دوسرا مہینہ بھی شروع ہو گیا۔ اس عرصہ میں مرمت کے سلسلہ میں کچھ تجاویز بھی قطعیت کو پہنچ گئی تھیں۔ لیکن کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ رقم اس کے پاس نہیں ہے۔

اور آج جب کہ اسے رقم دیے ہوئے پورے دو مہینے گزر چکے تھے اور اس کا داماد ابھی تک رقم واپس نہیں کر سکا تھا۔ فجر کے بعد کچھ لوگوں نے دوسرے تیسرے دن سے کام شروع کر دینے کے بارے میں گفتگو شروع کی تھی جس میں اس نے بڑی بے دلی سے حصہ لیا لیکن تب سے وہ

بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بازو پڑے ہوئے شملے کو سر پر باندھنے لگا۔ اچانک باہر کسی نے اسے آواز دی۔ جلدی جلدی شملہ باندھ کر وہ باہر نکلا۔

''نانا'' اس کے سامنے شرف الدین پٹواری کا لڑکا تھا۔ ''ابا نے کہا ہے شام میں سمنٹ کے گتے دار صاحب آئیں گے۔ آپ رقم لے کر گھر پر آ جائیں۔'' وہ چلا گیا۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سارا وجود برف کے مجسمے میں بدل گیا ہو۔ ایک قدم بھی اٹھانا اسے ناممکن سا لگ رہا تھا۔ اس نے بہ مشکل دروازے کا سہارا لیا اور مردہ قدموں سے چلتا ہوا اندر آ گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ رقم کہاں سے لائے؟ لوگوں کو کیا جواب دے؟ کیا اس کی برسہا برس کی ریاضت مٹی میں مل جائے گی؟ کیا گاؤں والوں کو اس بات پر حیرت، رنج اور غصہ نہیں ہو گا کہ اس نے امانت میں خیانت......؟ ہاں وقت پر امانت کا واپس نہ کرنا خیانت ہی کہلاتا ہے۔ اور وہ بھی خدا کی امانت میں خیانت! اس کی پیشانی پر لاتعداد پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ کیا وہ لوگوں کو اپنے اوپر نام دھرتے برداشت کر سکے گا وہ جس کی پاکیزگی، ایمانداری اور خدا پرستی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ چوراہے پر بے عزت ہو جائے گا۔ کیا اس کی سفید ڈاڑھی پر ایک سنگین الزام کی کالک پت جائے گی۔ وہ کانپ اٹھا۔ اور اچانک اس کے کانوں میں سینکڑوں آوازیں چیخنے لگیں۔ یہ دھوکے باز ہے! یہ بے ایمان ہے! یہ خدا کی آڑ لے کر مخلوق کو دھوکا دیتا ہے۔ اس نے ہمارے اعتماد کا خون کر دیا۔ اس کے منہ پر تھوک دو!!

''نہیں'' وہ دل ہی دل میں چیخ اٹھا۔ تب اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا اور جیسے کسی نے اسے بجلی سے چھو دیا۔ ہاں ایک ہی صورت ہے بس ایک۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ اس نے جھٹ چھت کی کھپریل کی طرف دیکھا اور پھر کچھ ڈھونڈنے لگا جلد ہی اس کے ہاتھ میں ایک رسی آ گئی اس نے اس میں گرہ ڈالی اور چھت پر لگی شہتیر کی طرف اسے پھینکا۔ پھندا لگ گیا۔ اس نے دوسری طرف بھی پھندا بنایا اور اسے اونچا کر دیا۔ اس کا دل یوں زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینے کی دیوار پھلانگ کر باہر آ جائے گا۔ اور جسم کے لاتعداد مسامات سے پسینے کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ایک چھوٹا سا پرانا اسٹول پھندے کے نیچے رکھ کر جمن اس پر چڑھ گیا اور پھندا گلے میں ڈالنے ہی کو تھا کہ جیسے کسی نے دل سے آواز دی۔ ''ٹھہرو...... وہ گھبرا گیا...... تم خودکشی کر رہے ہو۔ بزدل کہیں کے، حرام موت مرو گے؟ یہ اتنے برسوں کی عبادت

اسی لئے تم نے کی تھی کہ جہنم کا ایندھن بن جاؤ۔ کیا یہی تمہاری ساری زندگی کا حاصل ہے!!'' وہ کانپنے لگا۔ کانپتا رہا۔ اچانک وہ اسٹول سے پھسل پڑا نیچے گرتے ہی اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی۔ مٹی کے لیپے ہوئے فرش میں بہت دنوں سے ایک نوکدار پتھر ابھر آیا تھا۔ جسے نکالنے کے بارے میں وہ سوچتا ہی رہا تھا۔ کسے پتہ تھا کہ وہی پتھر اس کی کنپٹی میں بری طرح چبھ جائے گا۔ خون کا ایک فوارہ سا نکلا۔ دوسری بار جب اس نے چیخنے کے سے انداز میں پڑوس کے محمود کو پکارا تو محمود کے ساتھ کچھ لوگ بھی اندر آ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ جمن کا چہرہ خون میں لت پت تھا۔ ڈاڑھی خون میں رنگ گئی تھی۔ وہ بدحواس اس کی طرف لپکے۔

''خ...... خدا کا...... ش...... شکر ہے۔'' جمن کی اکھڑی اکھڑی سانسوں نے کچھ الفاظ اگلے ...... لا ...... ا...... وہ شاید کلمہ پڑھنے ہی والا تھا کہ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ مر چکا تھا۔

عشاء میں جب گاؤں والے اپنے دلوں پر ایک بھاری غم کا بوجھ لیے جمن کی بیٹی اور داماد کو اطلاع دینے کے بارے میں بات کر ہی رہے تھے کہ انھیں اندھیرے میں کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ نزدیک آنے پر انھوں نے حیرت سے دیکھا۔ وہ جمن کا داماد تھا۔

''ماموں کہاں ہیں؟'' وہ سلام کے بعد بولا۔

کچھ دیر بعد ایک نے تھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ انتقال کر گئے۔''

''انتقال کر گئے!'' جمن کے داماد پر جیسے بجلی گر پڑی اور اس کے ہاتھ سے وہ تھیلی گر پڑی جس میں دو ہزار روپے وہ اپنے کسی دوست سے قرض لے کر جمن کو واپس کرنے آیا تھا۔

☆☆☆

گر پڑے۔ گر کر اٹھے

ابھی پوری طرح شام نہیں ہوئی تھی۔ گرمیوں کا سورج، ابھی مغرب میں جھکا نہ تھا لیکن قاسم، ابھی سے سڑک پر بجلی کے کھمبے کے نیچے آ بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سلیٹ اور دوسرے میں ہنڈی (گولک) تھی۔ آتے ہی اس نے سلیٹ نیچے رکھ دی تھی اور ہنڈی کا دہانہ آہستہ آہستہ بڑا کرنے لگا تھا۔ تاکہ اندر جمع کیے ہوئے سکوں کو باہر نکال کر گن سکے۔ تین روپیوں کی اس خوش نما مٹی کی بنی ہوئی ہنڈی، پچھلے دو مہینوں سے اس کے ساتھ تھی۔ اس وقت سے جب کہ بالیا کمہار کے ہاں سے بہت سے گھڑوں، ہانڈیوں، صراحیوں اور ہنڈیوں کے ڈھیر میں سے اس نے اس ہنڈی کو چنا تھا۔ بھانت بھانت کے برتنوں کے اس بے ہنگم ڈھیر میں یہ چھوٹی سی ہنڈی اسے بڑی دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا ''ہنڈی چھوٹی ہے تو کیا ہوا اسے کون سا قارون کا خزانہ محفوظ کرنا ہے!''

اس نے وہ ہنڈی اٹھالی تھی اور اسے ٹھونک بجا کر چاروں طرف سے ایسے دیکھنے لگا جیسے اس میں پانی ٹھہرانے کا ارادہ ہو! بالیا سے اس نے قیمت پوچھی۔ ''چار روپے آٹھ آنے......'' بالیا نے اپنی کھرکھراتی آواز میں جواب دیا۔

''باپ رے باپ! ساڑھے چار روپے! وہ بول اٹھا ''لینا نہیں ہے تو جاؤ'' بالیا نے جھٹ سے اس کے ہاتھ سے ہنڈی چھین لی۔

''دو روپے لے لو'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''چلو! نکلو یہاں سے!'' بڈھا بڑا چڑچڑا تھا۔

''کیا لے رہیں نہیں؟'' بڈھا بڑا گھاگ تھا۔

''اچھا لے لیو! بھونی کرو!'' بڈھے نے اس کے ہاتھ میں ہنڈی تھما دی۔ قاسم نے ہنڈی کو پھر ایک بار غور سے دیکھا۔ بڈھے کو تین روپے دے دینے کے بعد بھی اس کے پاس

ایک روپیہ بچ رہا تھا۔ کیوں نہ ایک روپے کے وہ چاکلیٹ کھالے؟ نہیں۔ اسے کلاس ٹیچر کا خیال آیا۔ وہ کہتے تھے کبھی بے کار پیسہ خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ پیسے جوڑ کر رکھنے سے وقت پر کام آتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اسی طرح انھوں نے بی۔ اے تک اپنی پڑھائی کا خرچہ اٹھایا تھا۔ قاسم کو پتہ نہیں تھا کہ بی۔ اے کیا ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی بی۔ اے پڑھنے کے بعد کلاس ٹیچر جیسا عقل مند ہو جاتا ہے تو وہ بھی بی۔ اے پڑھے گا۔ ایک ایک پیسہ جوڑ کر...... بسم اللہ کہہ کر وہ ایک روپیہ اس نے اپنی نئی نویلی ہنڈی کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ اور پھر ہنڈی کو ہلا ہلا کر روپے کی ہنڈی کے دیواروں سے ٹکرانے کی دل خوش کن آواز سننے لگا!

اس دن سے قاسم پر ایک دھن سی سوار ہو گئی تھی روپے جمع کرنے کی۔ اس کا باپ سیکل رکشا چلا کر روپیہ کماتا تھا۔ روزانہ دن بھر کی مشقت کے بعد وہ تھکن اتارنے کے لیے سیندھی (تاڑی) پی کر نشے میں دھت گھر لوٹتا تھا۔ پھر بیوی سے کسی نہ کسی بات پر خوب جھگڑتا۔ کبھی کبھی پیٹ بھی دیا کرتا، تو کبھی کھانا زہر مار کر یا بغیر کچھ کھائے وہ سو جاتا تھا۔

جب وہ سو جاتا تھا تو ایک دو منٹ تک اس کی ماں، امینہ بی چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہتی۔ پھر اٹھ کر اپنے شوہر کی جیب ٹٹولتی اور جو کچھ رقم بچی ہوئی ہوتی اسے نکال لیتی۔ پھر انہیں گنتی اور اس کے بعد اپنے شوہر کے ان لفنگے دوستوں کو کوستی جو اسے ڈھکیل کر سیندھی خانے لے جاتے۔ حالاں کہ اس کے شوہر کو ڈھکیل کر لے جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ وہ خود ہی کسی نہ کسی کو ساتھ ضرور لے جاتا۔

یہی وہ وقت ہوتا تھا جب قاسم خاموشی سے آگے بڑھتا اور ماں کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا۔ تب اس کی ماں کا چہرہ اچانک کسی انجانی روشنی سے منور ہو جاتا اور وہ قاسم کے ہاتھ پر چند سکے رکھ دیتی۔ وہ خاموشی سے باہر لپک جاتا۔

جھونپڑی کے پچھواڑے ایک بلند و بالا مکان تھا۔ اسی طرف وہ جھونپڑی کی چھت کے نیچے جو تاڑ کے پھڑوں سے بنی تھی، ہاتھ ڈال کر وہاں چھپی ہوئی ہنڈی نکالتا اور وہ سکے اس میں ڈال دیتا۔

اس کا باپ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ ماں کہتی تھی کہ وہ پہلے کسی اچھے آفس میں چپراسی تھا۔

تب وہ بہت اچھا تھا۔ اسے بیوی بچوں اور گھر کا بڑا خیال رہتا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ اسے آفس سے نکال دیا گیا۔ تبھی سے وہ بگڑ گیا تھا۔ قاسم جب چھوٹا سا تھا تو اس کا باپ اسے گود میں بٹھا کر اس کا سر سہلاتا اور کہتا ''میرا بیٹا خوب پڑھے گا پھر افسر بنے گا۔ راج کرے گا۔'' ایسا کہتے کہتے وہ خلا میں گھورنے لگتا۔ لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب کہ اس کا باپ نوکری کرتا تھا!

جب سے اس نے رکشا چلانا شروع کیا تھا اسے کسی کی کوئی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ اسے اپنے بیٹے اور ننھی بیٹی کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ بس ماں ہی تھی جو ان دونوں کو بہت چاہتی تھی اور اپنی تنخواہ انہی پر خرچ کر دیا کرتی۔ وہ پیچھے کے بلند مکان میں گھریلو کام کیا کرتی تھی۔ اس مکان کے لوگ بہت اچھے تھے۔ مالکن بھی بہت خوب صورت تھیں۔ ان کی ایک لڑکی تھی جو اپنے سرخ گالوں اور سنہری بالوں کی وجہ سے بالکل پری جیسی لگتی تھی۔ وہ اسکول جایا کرتی۔ مالک اور مالکن جب ایک دوسرے سے بات کرتے تو اسے بڑا اچھا لگتا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو ''آپ آپ'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور ایک اس کا باپ تھا جو اپنی بیوی سے گالی گلوج کیا کرتا تھا...... خیر...... اس کے باپ کا تو ذکر ہی کرنا فضول تھا!

قاسم نے سکے' ایک ایک کر کے باہر نکالے اور انہیں گننے لگا۔ ایک بار جو سر اٹھایا تو دیکھا کہ اس کی ماں' رات کے کھانے کی رکابی' ایک ہاتھ میں پکڑے دوسرے ہاتھ میں اپنے سر کی چادر کا سرا پکڑے ہوئے چلی آ رہی ہے۔ اسے دیکھ کر قاسم کو جھونپڑی کے اندر سوئی ہوئی منی کا خیال آیا وہ اسکول سے واپس آیا تھا تو ماں اسے تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ تب سے منی مسلسل سوئے جا رہی تھی۔

اس کی ماں نے پوچھا ''کیا منی اٹھی رے قاسم؟''

''نہیں ماں'' وہ سکے گنتا رہا۔ دس روپے میں جغرافیہ کی کتاب ملتی ہے خدا کرے کہ ہنڈی کے اندر سے اتنے روپے ہی نکل آئیں۔ جغرافیہ کا ٹیچر بڑا ہی جلاد تھا۔ ایک مہینے سے مسلسل اس کی جان کھائے جا رہا تھا۔ پچھلی تنخواہ پر ماں اسے روپے دے دیتی لیکن اس کے باپ کے رکشا کا پہیہ خراب ہو گیا تھا اسے ٹھیک کروانا پڑ گیا اور سارے روپے خرچ ہو گئے۔

اس کے کانوں میں رکشا کے آنے کی گڑگڑاہٹ آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا

باپ آیا تھا۔ اس نے جلدی سے رکشا کھڑا کیا اور اندر جھونپڑی میں چلا گیا۔ قاسم سکے گنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اندر سے ماں باپ کی تیز اونچی آوازیں آنے لگیں پھر اچانک اس کی ماں نے رونا شروع کر دیا۔ حسب معمول شاید اس کے باپ کا ہاتھ چل گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سکے گننے پورے کر لیے۔ پورے سولہ روپے تھے۔ چلو! خدا کا شکر ہے اب وہ جغرافیہ کی کتاب خرید سکے گا اور شاید چاکلیٹ بھی۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ اس کا باپ اچانک جھونپڑی سے باہر نکلا اس کی نظر ایک دم قاسم پر پڑی اور وہ اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ہنڈی کو غور سے دیکھنے لگا۔ قاسم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

''کس کے ہیں رے یہ روپے؟'' اس کے باپ نے سختی سے پوچھا ''میرے ہیں'' وہ حواس باختہ ہو گیا۔ ''میں جمع کیا سو جغرافیہ کی کتاب کے واسطے۔''

''ادھر لا......'' اس کا باپ جھپٹا۔

''میرے کو کتاب لینا ہے!'' وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔

''ابے لا! کاں کی کتاب۔ بیٹا پڑھ لکھ کر بڑے افسر بنتئیں!'' اس کے باپ نے ایک زور کا چانٹا قاسم کے گال پر رسید کیا اور ہاتھ سے سارے سکے چھین لیے۔ ہنڈی بھی گر کر ٹوٹ گئی۔ قاسم رونے لگا۔ اس کے باپ نے جلدی جلدی روپے گنے۔ کچھ سکے زمین پر گر بھی گئے لیکن اس نے توجہ نہ کی۔ بس گنے ہوئے سکے جیب میں رکھے رکشا لیا اور یہ جا...... وہ جا......

قاسم کا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہے لیکن آواز ہی نہ نکلی بس وہ آہستہ آہستہ روتا رہا جیسے ہلکی ہلکی پھوار ہوتی ہے۔ اتنے دنوں کی محنت غارت ہو گئی تھی۔ کیسی کیسی مشکلوں سے اس نے روپے جمع کیے تھے!

اندر سے اس کی ماں کی رندھی ہوئی آواز آ رہی تھی وہ اس کے باپ کو کوس رہی تھی۔ حرام زادہ! ماٹھی ملا! اس کو قئے دس لگو! میرے کو مارتا۔ بچہ کو بھی مارا شاید...... اس کے دیدے پٹم ہو جاؤ!'' کوستے کوستے وہ باہر آ گئی ''تیرے کو مارا نئیں؟'' وہ قاسم سے بولی ''جلاد! اس کے پاؤں کو گھو کرو لگو......'' اس نے قریب آ کر قاسم کو لپٹا لیا۔ قاسم اور زور سے رونے لگا۔ جب ذرا چپ ہوا تو ماں بولی ''چل...... اندر چل کے کھانا کھا لے۔''

''نہیں......'' قاسم نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''چل جلدی......ضدمت کر!'' ماں نے اس کے آنسو پونچھے۔

وہ بولا ''میں بوروبل پر منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔'' ماں چلی گئی۔ قاسم چلنے لگا۔ تب اچانک اس کی نظر زمین پر گرے ہوئے سکوں پر پڑی جو اس کے باپ کے ہاتھوں سے گر گئے تھے۔ قاسم نے جھٹ سے وہ سکے چن لئے۔ گنا تو پورے چار روپے تھے...... چار روپے! وہ انھیں غور سے دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بالیا کمہار کی دکان پر کھڑا ایک نئی ہنڈی خرید رہا تھا۔

بازیافت

بچپن کا ساتھ ایک ناقابل فراموش تجربہ ہوتا ہے۔ اور بچپن کے دوست ساری عمر کے دوست ثابت ہوتے ہیں چاہے وہ بعد میں بچھڑ کر عمر بھر نہ ملیں۔ دوستی کے وہ لمحے شاید زندگی کے عزیز ترین لمحے ہوتے ہیں کیوں کہ ان لمحوں میں بچپن کے نازک احساسات' چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں' لڑائیوں اور ان سبھی باتوں سے لطف اٹھانے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ ان دنوں کی انمٹ چھاپ ساری زندگی دل و دماغ کے نہاں خانوں میں منور رہتی ہے اور اسے وقت کے بے رحم ہاتھ بھی کھرچ کر مدھم نہیں کر سکتے۔

بچپن کی ایسی ہی یادوں کے دھند لکے سے میرے ذہن کی سطح پر ایک خوش شکل چہرہ ابھر آتا ہے۔ کھلا کھلا رنگ' روشن آنکھیں' چمکیلے ہموار دانت' گھنے گھنگریالے بال جن میں مانگ نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور سب سے بڑھ کر اس کی مسکراہٹ جو دھیرے دھیرے دہانے کے کونے سے نمودار ہوتی اور پانی کی لہروں کی طرح سارے چہرے کو منور کرتے ہوئے آنکھوں میں لہرا جاتی۔ ایسی بھرپور مسکراہٹ میں نے کم لوگوں کے چہرے پر دیکھی ہے۔ یہ مسکراہٹ سہیل کی جاذب نظر شخصیت کا ایک نمایاں حصہ تھی۔ اس کے ذریعہ وہ اجنبی لوگوں میں یک لخت اپنائیت کا احساس جگا دیتا تھا۔ کچھ ایسا ہی احساس' آج سے کافی عرصہ پہلے' مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ جب اورینٹ اسکول کی آٹھویں کلاس میں' میں اس سے ملا تھا۔ وہ کلاس میں کئی شرارتی لڑکوں کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جو مجھے 'نیا مرغا' جان کر میری طرف اشارے کرتے ہوئے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ تب مجھے وہ اس گروہ میں سب سے منفرد نظر آیا۔ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں تمسخر نہیں تھا۔ تجسس تھا اور ایک طرح کی اپنائیت تھی۔ پیریڈ ختم ہونے کے بعد جب ٹیچر چلے گئے اور میں نے بازو رکھا ہوا اپنا بیاگ

اٹھانا چاہا تو وہ اُلجھ کر رہ گیا۔ کلاس میں زبردست قہقہے گونجے، کسی نے بیاگ کا تسمہ کرسی کے پیچھے باندھ دیا تھا۔ یہ مجھے مرغا بنانے کا پہلا مظاہرہ تھا۔ سہیل پہلا لڑکا تھا جس نے تسمہ کھولنے میں میری مدد کی تھی۔ اگلے پیریڈ تک ہم دونوں میں دوستی ہوگئی۔ دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں کو رسالے اور کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ آہستہ آہستہ ہماری دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ مزاج کے اعتبار سے بھی ہم دونوں میں قریب قریب یکسانیت تھی۔ دونوں کم گو اور بے حد حساس تھے۔ پڑھائی میں، بہت اچھے یا تیز نہیں تو برے بھی نہیں تھے۔ ہم ایک دوسرے کے گھروں پر بھی آنے جانے لگے۔

سہیل اسکول سے کافی دور رہتا تھا۔ متوسط طبقے کے اس محلے کے ایک مختصر سے مکان میں، وہ اس کے والدین، ایک بڑی بہن اور چھوٹے بھائی عقیل کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے والدین دراصل آگرہ کے رہنے والے تھے۔ بڑے ہی سلجھے ہوئے اور خوش اخلاق۔ بڑی بہن نادرہ کالج میں پڑھتی تھیں، گوری سی نازک سے نقوش، بہت ہی پیاری باتیں کرتی تھیں اور بڑی ہی محبت والی، میں جب بھی ان کے گھر جاتا وہ مجھے ضرور کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی چیز کھلایا کرتیں۔ ایک بار اسکول میں میری شرٹ کا بٹن ٹوٹ گیا۔ واپسی میں سہیل کے گھر رکا تو انھوں نے بڑے اصرار سے میرے شرٹ کا بٹن ٹانک دیا تھا۔ وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتی تھیں۔ میں بھی انہیں باجی کہنے لگا۔ میری حیدرآبادی بول چال کی اردو سہیل کے سب گھر والوں کے لئے باعث تفریح تھی۔ وہ بڑا لطف اٹھایا کرتے۔ مجھے گانے کا بھی شوق تھا۔ فلمی گانے اکثر کلاس کے خالی پیریڈز میں اپنے ہم جماعت لڑکوں کی فرمائش پر میں سنایا کرتا۔ ایک دو لڑکے بنچ کو طبلے اور ڈھولک کی طرح استعمال کرتے ورنہ منہ سے ہی سنگت کیا کرتے تھے۔ سہیل کی باجی کبھی کبھی بہ اصرار مجھے کچھ گانے گائے بغیر جانے نہیں دیتی تھیں۔

مجھے ریاضی سے سخت چڑ تھی جب کہ سہیل ریاضی میں بہت اچھا تھا۔ سائنس سے میں گھبراتا تھا مگر سہیل کا شمار، سائنس کے اچھے طلباء میں ہوتا تھا۔ البتہ انگریزی اور اردو دونوں کو پسند تھے۔ دونوں کو خاص طور پر اردو شاعری سے بڑا شغف تھا۔

اسکول سے چھٹی ملنے کے بعد ہم دونوں کندھوں پر اپنے بیاگ اٹھائے' گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ راستے میں ایک جگہ چنے کی دکان پر رکتے' ایک ایک پڑیا چنوں کی خرید لیتے تھے اور چنوں کو چباتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے گھر کا راستہ لیتے۔ پہلے سہیل کا مکان آتا تھا جو مضافاتی ٹرین کے اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔ تھوڑی دیر سہیل کے گھر پر رک کر اور پانی پی کر میں اسے خدا حافظ کہہ کر نکل پڑتا۔ آگے ایک سڑک آتی تھی جسے پار کرنے کے بعد ایک باندھ سا بنا ہوا تھا۔ دراصل یہ ریلوے ٹریک تھا جو سڑک کے متوازی لیکن کافی اونچائی پر تھا۔ سڑک پار کر کے میں اس باندھ پر چڑھ جاتا تھا اور ریل کی پٹریاں پھلانگ کر دوسری جانب اتر جاتا۔ وہاں سے کوئی تین چوتھائی میل کے فاصلے پر میرا مکان تھا۔ آٹھویں سے لے کر دسویں کلاس تک ہم دونوں کا شام کا یہی معمول تھا۔ چھٹیوں میں بہت کم ملا کرتے تھے کیوں کہ گھر سے بغیر ضرورت نکلنے پر ہم دونوں پر ماں باپ کی طرف سے پابندیاں تھیں۔ جب ہم دسویں کلاس میں پہنچے تو ایک دن' اچانک عجیب واقعہ ہوا ہماری کلاس میں ایک نہایت شریر لڑکا تھا' راشد نام تھا اس کا۔ اسے پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس زیادہ تر وقت لڑکوں اور ٹیچروں کو ستانے اور تنگ کرنے میں گزرتا تھا۔ سبھی اس سے ناخوش تھے۔ کئی بار اسے اسکول سے نکالنے کی کوششیں بھی ہو چکی تھیں لیکن تعلیمات کے محکمے میں اس کے کوئی رشتہ دار اعلیٰ عہدے پر فائز تھے جس کی وجہ سے وہ بچ جاتا تھا۔

ہم سب فزیکل ٹریننگ کلاس کے پیریڈ میں' میدان میں ستاتے ہوئے بیٹھے تھے کہ اچانک راشد نے ایک اور لڑکے غضنفر کو پکارا ''اے غضنفر! ادھر آ تجھے ایک چیز دکھاؤں'' وہ زور سے ہنسا۔ دونوں کوئی رسالہ دیکھ رہے تھے اور زور زور سے ہنس رہے تھے۔ پھر راشد نے سہیل کو پکارا ''ارے سہیل! ادھر آ۔ رسالے میں اپنی بہن کی تصویر دیکھ''۔ سہیل جو کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا چونک گیا اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا'' بکواس مت کرو! میری کوئی بہن نہیں ہے۔''

راشد نے قہقہہ لگایا'' سالے! اپنی بہن فلم اسٹار زرینہ کو نہیں پہچانتا؟ کیسا بھائی ہے

تو۔" سہیل اچانک راشد کی طرف جھپٹا اور دونوں گتھم گتھا ہوئے۔ میں اور کچھ لڑکے دوڑے اور انہیں الگ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ راشد بری طرح گالیاں بک رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم نے انہیں الگ کیا۔ اتنے میں ڈرل ماسٹر کی سیٹی گونجی اور وہ اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے نمودار ہوئے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے انھوں نے پوچھا۔ کچھ لڑکوں نے انہیں ساری بات سنائی۔ انھوں نے راشد کو ڈانٹا "تمہاری شرارتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ آئندہ پھر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔"

اس دن اسکول سے واپس ہوتے ہوئے سہیل بہت خاموش تھا۔ میں نے بھی خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ خاموشی کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے اور کچھ کہنے سے بغیر ہی ذہنی ہم آہنگی ہو تو ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھ میں آ ہی جاتا ہے۔

تھوڑی دور تک چلنے کے بعد سہیل آہستہ سے بولا "میں یہ اسکول چھوڑ دوں گا!"

"کیا؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"ہاں شوکت۔ اب میں اس اسکول میں پڑھ نہیں سکوں گا۔"

"پاگل ہوئے ہو؟" میں بول اٹھا۔ "ایک کمینے کی باتوں سے اتنا اثر لینا ٹھیک نہیں ہے۔ سب راشد جیسے نہیں ہوتے۔

"بات اس کمینے کی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "تم شاید سمجھو گے نہیں!"

"آخر ایسی کیا بات ہے جو میں سمجھ نہیں سکتا۔ مجھے بتاؤ تو۔"

سہیل تھوڑی دور تک خاموش چلتا رہا۔ پھر بولا "شوکت! جو کچھ راشد کہہ رہا تھا وہ سب سچ ہے۔"

"کیا؟" میں زمین میں گڑ سا گیا۔

"ہاں! یہی سچ ہے۔" شمع کے جس شمارے میں وہ تصویر چھپی ہے وہ میری سگی بہن فاخرہ باجی ہیں جنہیں باجی کہتے ہوئے بھی مجھے اب شرم آتی ہے۔ اب ان کا فلمی نام زرینہ رکھا گیا ہے۔

"لیکن......" میں دم بخود تھا۔ "آج تک...... تم نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا؟

''ہاں! میرے ابو اور امی نے مجھے اور سبھی کو یہ بات کسی کو بتانے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔''

''لیکن سہیل۔تمہاری باجی فاخرہ فلموں میں آخر گئیں کیسے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' سہیل نے ٹھنڈی سانس لی۔

''دیکھو!اگر تم مجھے بتانا مناسب سمجھتے ہو تو بتاؤ۔ ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ میں بالکل برا نہ مانوں گا۔'' میں نے کہا۔

اب تم سے کیا چھپانا ہے شوکت! تم تو میرے سب سے قریبی دوست ہو۔

تب سہیل نے مجھے سارا واقعہ سنایا۔ سہیل کے ماں باپ کئی برسوں پہلے آگرہ سے بمبئی گئے تھے۔ وہاں سہیل کے چچا' ریس کلب کے اسٹیوارڈ (Steward) تھے۔ خاصے خوشحال آدمی تھے۔ گو سہیل کے ابو کو ان کا پیشہ پسند نہ تھا لیکن انہیں امید تھی کہ جلدی ہی انہیں کسی نہ کسی لائبریری میں لائبریرین کی نوکری مل جائے گی اور وہ جلد ہی اپنے خاندان کو لے کر کہیں الگ رہنے لگیں گے۔ سہیل کے چچا اپنی بیوی کے انتقال کے بعد کولابہ میں بڑے سے فلیٹ میں اکیلے رہتے تھے۔ ان کے اصرار پر سب وہیں ٹھہرے۔ ساتھ میں سہیل کی دادی بھی تھیں۔ جو چچا ہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ کچھ مہینوں میں سہیل کے ابو کو یہ احساس ہونے لگا کہ بمبئی کی مشینی زندگی انہیں راس نہیں آئے گی۔ انہیں ایک بار حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا تھا اور انہیں وہ شہر بہت پسند آیا تھا۔ اب انھوں نے سب کے سامنے حیدر آباد منتقل ہو جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو سہیل کی دادی ساتھ آنے کو راضی نہ ہوئیں اور چوں کہ وہ فاخرہ باجی کو بہت چاہتی تھیں اس لئے انھوں نے سہیل کے ابو سے ضد کر کے فاخرہ کو اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ سہیل اپنے ماں باپ' باجی اور عقیل کے ساتھ حیدر آباد چلا آیا۔ گو سہیل کے ابو' فاخرہ باجی کو بمبئی میں چھوڑ آنے سے بالکل متفق نہ تھے لیکن ضعیف ماں کی مرضی کے آگے انھوں نے اپنا سر جھکا دیا۔

فاخرہ باجی کی کالج کی تعلیم بمبئی ہی میں ہوئی اور وہ جلد ہی بمبئی کی تیز رفتار زندگی کے سانچے میں ڈھل گئیں۔ کچھ برسوں کے بعد سہیل کے چچا کو جو ریس اور سٹہ کھیلنے کے بڑے رسیا تھے' سٹے کے ایک دھندے میں زبردست نقصان برداشت کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے فلیٹ اور

کار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ریس کلب کی اسٹیوارڈ شپ بھی گئی۔ راتوں رات قلاش ہو گئے۔

ان ہی دنوں مشہور پروڈیوسر۔ ڈائرکٹر اے۔ آر کاردار نے مشہور ٹوتھ پیسٹ بنانے والی فرم کولینوس کے اشتراک سے فلموں کے لیے نئے چہروں کی دریافت کے سلسلے میں خواہشمند لڑکیوں کے لیے ایک مقابلہ منعقد کیا تھا۔ اس مقابلے کے لیے سہیل کے چچا فاخرہ کو بہلا پھسلا کر لے گئے۔ اتفاق یہ ہوا کہ فاخرہ فائنل مقابلے میں کچھ اور لڑکیوں کے ساتھ چن لی گئی۔ خوب پبلسٹی ہوئی۔ تحفے تحائف ملے اور فاخرہ کو اے۔ آر۔ کاردار نے آئندہ بننے والی اپنی تین فلموں کے لیے بطور ہیروئن سائن کر لیا۔ سہیل کی دادی کو پتہ چلا تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ سہیل کے ماں باپ پر جیسے بجلی ہی گر پڑی۔ انھوں نے فوراً سہیل کے چچا کو خط لکھا کہ فاخرہ کو حیدر آباد بھیج دیا جائے ورنہ وہ زندگی بھر اس کا چہرہ نہ دیکھیں گے۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ چچا کے منہ کو خون لگ چکا تھا۔ انھوں نے فاخرہ کے فلمی افق پر جگمگانے میں اپنے شاندار مالی مستقبل کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ انھوں نے فاخرہ کو بھی آئندہ کی شاندار زندگی کے سبز باغ دکھانے شروع کر دیے۔ ان کی دن رات کی چرب زبانی کام کر گئی۔ فاخرہ فلموں میں کام کرنے کے اپنے ارادے پر ڈٹ گئی۔ دادی کے آنسوؤں اور ماں باپ کی خواہشوں نے کچھ اثر نہ کیا اور اس طرح راتوں رات فاخرہ' زرینہ بن گئی۔

سہیل کے ماں باپ کے لیے یہ ایک زبردست صدمہ تھا لیکن انھوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور سہیل کے ابو نے اپنے بھائی کو لکھ دیا کہ اس دن سے ان کے اور خاندان کے دیگر افراد کا تعلق فاخرہ اور اس کے چچا سے بالکل ٹوٹ چکا ہے لہذا آئندہ وہ دونوں کبھی قریب آنے کی کوشش نہ کریں۔

لیکن جس بات کو ذاتی طور پر دل پر پتھر رکھ کر انھوں نے قبول کر لیا تھا وہ آہستہ آہستہ ساری دنیا پر ظاہر ہوتی جا رہی تھی۔ بدنامی کا کہر غیر محسوس طور سے ان کے اطراف پھیلتا جا رہا تھا۔ آج کل میڈیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ گھر گھر میں فلموں اور ٹیلی ویژن نے بلا لحاظ عمر سبھوں کو اپنے طلسم میں مقید کر لیا ہے اور فلموں اور ٹی وی سے وابستہ ہونا عزت وتوقیر کا باعث سمجھا جاتا

ہے۔ ۱۹۵۰ء کے آس پاس کے دور میں عام لوگوں کے دلوں میں فلموں کے تعلق سے تحفظات تھے۔ اس کا اندازہ اب لگانا بہت مشکل ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر متوسط طبقے کے گھرانوں میں فلمیں دیکھنا اور فلموں کی باتیں کرنے کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور فلموں میں کام کرنا گویا بدنامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لینے کے برابر تھا۔

اس تناظر میں سہیل کے گھر والوں کی ذہنی اذیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ سہیل اب پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اس کی زندہ دلی، شگفتگی اور سب سے بڑھ کر اس کی وہ شاداب مسکراہٹ! کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اب زیادہ تر اس کے چہرے پر سوچ کی ایک دبیز نقاب پڑی رہتی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے رک جاتا اور کچھ سوچنے لگتا۔ پڑھائی سے بھی اس کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ کھیل کا تو وہ پہلے سے بھی کچھ ایسا شائق نہ تھا۔ ڈرل کے پیریڈ میں اکثر وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے لائبریری میں جا بیٹھتا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑتا۔ اب راشد جیسے بد فطرت لڑکے کے علاوہ کلاس اور اسکول کے کئی اور لڑکے بھی اس کو دیکھ کر کبھی کبھی ''زرینہ''، ''زرینہ''! پکار اٹھتے تھے لیکن سہیل سر جھکا کر سامنے سے گزر جاتا۔ اس بات پر میں کئی لڑکوں سے الجھ بھی چکا تھا لیکن بعد میں سہیل کے منع کرنے پر میں نے بھی ان موقعوں پر خاموشی کو ہی ترجیح دینی شروع کر دی۔

سہیل کے گھر والوں میں بھی ایک تبدیلی آ گئی تھی، سہیل کی امی اب زیادہ تر عبادت میں لگی رہتیں۔ باجی نادرہ پڑھائی یا گھر کے کام کاج میں اور تو اور چھوٹا بھائی عقیل بھی اب بڑا سنجیدہ نظر آنے لگا تھا لیکن ان ساری تبدیلیوں کے باوجود میرے تعلق سے ان کے سلوک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مجھ سے وہی پہلا سا خلوص اور اپنائیت بھی برتا کرتے۔

ایک بار اسکول سے واپسی پر سہیل اپنے گھر پر نہیں رکا۔ میرے ساتھ ساتھ سڑک پر آ گیا۔ ریلوے ٹریک پار کرنے کے بعد میدان میں ہم دونوں گھاس پر بیٹھ گئے۔ اس کی خاموشی سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے دل میں کوئی طوفان مچل رہا ہے۔

''کیا بات ہے سہیل؟'' میں نے ہی پہل کی۔

''شوکت! کل امی رات کو فاخرہ باجی کو یاد کر کے بہت روتی رہیں۔''

اس کا گلا رندھ گیا ''میرا بس چلے تو بمبئی جا کر فاخرہ باجی اور ہمارے اس کمینے چچا کا خون کردوں۔'' ''اس بارے میں سوچنا چھوڑ دو سہیل'' میں نے کہا ''جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ تمہارا کام ہے امی اور ابو کو سمجھانا۔ ان کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا ہے۔''

وہ سال جیسے تیسے گزر ہی گیا اور پھر سالانہ امتحان آ گئے۔ سہیل اور میں زوروں سے پڑھائی میں لگ گئے۔ دن رات پڑھائی کی دھن سر پر سوار رہتی۔ کبھی سہیل کے گھر کے terrace پر بیٹھ جاتے تو صبح ہونے تک پڑھتے رہتے۔ صبح جب میں گھر جانے کی تیاری کرنے لگتا تو سہیل کی امی ناشتہ کیے بغیر جانے کی اجازت نہ دیتیں۔

خدا خدا کر کے امتحان ہو ہی گیا۔ سبھی پرچے اچھے ہوئے تھے۔ امتحان کے فوراً بعد سہیل کے گھر والے' کانپور اپنے کسی عزیز کے ہاں چلے گئے جب وہ واپس ہوئے تو امتحان کے نتائج کا بھی اعلان ہو چکا تھا۔ ہم دونوں ہی دوسرے درجہ میں کامیاب ہو گئے تھے۔ چند روز کے بعد سہیل نے ایک تکلیف دہ خبر سنائی۔ سہیل اور اس کے گھر کے سبھی افراد جلد ہی پاکستان منتقل ہونے والے تھے۔ خبر میرے لیے بڑی روح فرسا تھی۔ سہیل میرا سب سے قریبی اور جان چھڑکنے والا دوست تھا۔ ہم دونوں اس عرصے میں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ الگ ہونے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ لیکن شاید سہیل اور اس کے گھر والوں کے لیے گھٹن سے فرار کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ جن حالات سے وہ گزر رہے تھے ان سے باہر نکلنے کے لیے پاکستان چلے جانا ہی منزل قرار پا چکی تھی۔

پھر اچانک وہ شام بھی آ گئی جس کے گزرنے کے بعد صبح سہیل اور اس کے خاندان کو حیدر آباد ہمیشہ کے لیے چھوڑ جانا تھا۔ فاصلے کی وجہ سے میرا اسٹیشن تک ان کو وداع کرنے کے لیے جانا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میں نے سہیل کے والدین' عقیل اور باجی سے آخری ملاقات کی۔ سہیل کی والدہ مجھے گلے لگا کر رو پڑیں۔ مجھے بھی رونا آ گیا۔ باجی بھی رو رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا میں ان کے گھر کے باہر

آ گیا۔ ان کے گھر پر میں نے الوداعی نظر ڈالی۔ کل سے یہ گھر، اس کے مانوس در و دیوار، سبھی میرے لیے اجنبی ہو جائیں گے۔ یہ چوبی دروازہ مجھے نامانوس نظروں سے گھورے گا کیوں کہ اس کی آغوش سے اب کبھی سہیل کا مسکراتا ہوا چہرہ طلوع نہیں ہوگا۔ سنگ و خشت وہی رہیں گے لیکن ان سے خلوص کی گرمی اور محبت کی وارفتگی رخصت ہو جائے گی۔

باہر نکلنے کے بعد سہیل نے کہا ''چلو! تمہیں ریلوے لائن کے اس پار تک چھوڑ آتا ہوں۔'' ہم دونوں بوجھل قدموں سے چل پڑے۔ ریلوے لائن پار کی اور میدان میں پہنچے اور ایک بڑی سی چٹان پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد سہیل بولا ''یار! میرے پاکستان جانے کے بعد تم مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔''

''ہرگز نہیں!'' میں نے کسی قدر جوش سے کہا ''یہ کبھی نہیں ہوگا۔ میں تمہیں خط لکھتا رہوں گا۔ تم بھی جواب دینا نہ بھولنا!''

''ضرور..........'' سہیل رک کر بولا ''لیکن سنا ہے کہ ہندوستان سے پاکستان خطوط کے آنے جانے میں بہت وقت لگتا ہے اور بعض اوقات خطوط غائب ہو جاتے ہیں۔''

''پھر بھی میں خطوط برابر لکھتا رہوں گا'' میں نے کہا۔

آسمان پر بادل نہیں تھے، تارے کہیں کہیں نظر آ رہے تھے ہلکی سی ہوا چل رہی تھی لیکن فضا پھر بھی بوجھل سی تھی شاید یہ ہمارے بوجھل دلوں کا اثر ہو۔

سہیل نے کہا ''یار! مجھے فلموں سے سخت نفرت ہو گئی ہے اور شاید یہ نفرت عمر بھر میرا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ مگر پھر بھی آخری بار میں تم سے طلعت محمود کا وہ گانا سننا چاہتا ہوں ''ترانہ'' والا ''تم بہت اچھا گاتے ہو اسے''

چاروں طرف اندھیرا تھا۔ دور سڑک پر کبھی کبھی سواریوں کی روشنیاں چمک جاتی تھیں۔ فضا پر ایک عجیب سی اداسی مسلط تھی۔ میں نے طلعت کا وہ پرسوز گانا شروع کیا۔

''ایک میں ہوں ایک میری بے کسی کی شام ہے۔''

گانا جب ختم ہوا تو سہیل کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ میری آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر تک ہم ساکت بیٹھے رہے پھر سہیل نے کہا "اب مجھے جانا ہوگا۔ ابھی سامان باندھنا ہے۔ خدا حافظ! کراچی پہنچتے ہی تمہیں اپنے پتے سے مطلع کروں گا۔ تم برابر خط لکھا کرنا۔"

ایک بار پھر ہم گلے ملے اور پھر بوجھل قدموں سے اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئے۔

سہیل کے جانے کے بعد میں کالج میں داخلے کی کوششوں میں لگ گیا۔ داخلہ جلد ہی مل گیا۔ کالج کا ماحول اسکول سے یکسر مختلف تھا۔ یہاں زیادہ آزادی تھی۔ پڑھانے اور پڑھنے کے انداز بھی الگ تھے۔ سہیل کو کراچی گئے ہوئے دو مہینے ہو گئے کہ مجھے سہیل کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ سب خیریت سے ہیں۔ کرایہ کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ وہ کالج میں داخلے کی اور باجی کسی نوکری کی تلاش میں ہیں۔ عقیل کو البتہ اسکول میں داخلہ مل گیا ہے۔ ابو کو کسی لائبریری میں لائبریرین کی جگہ مل گئی ہے۔ سب مجھے بہت یاد کرتے ہیں۔

تقریباً ایک سال تک سہیل کے خطوط برابر آتے رہے۔ دوسرے سال ذرا کم آنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نئے حالات نے اسے بہت مصروف کر دیا ہے۔ تیسرے سال مجھے صرف ایک خط ملا۔ پھر خطوط آنے ہی بند ہو گئے۔ میں برابر اس کے پتے پر خطوط بھیجتا رہا لیکن کوئی جواب نہیں آتا۔ دل تڑپ جاتا کہ کسی طرح سہیل اور اس کے گھر والوں کی خیر خیریت کا پتہ چلے۔

اس دوران میں، میں نے گریجویشن کرنے کے بعد ماس کمیونیکیشن کا ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بمبئی کی ایک اڈورٹائزنگ فرم میں مجھے نوکری مل گئی۔ ایک دن "ٹائمز آف انڈیا" میں، میں نے شارجہ کی کسی فرم کا اشتہار پڑھا جس میں کسی پبلک ریلیشنز آفیسر کی ضرورت بتائی گئی تھی۔ میں نے درخواست دے دی۔ خوش قسمتی سے انٹرویو کے بعد مجھے اس نوکری کے لیے چن لیا گیا اور میں شارجہ چلا گیا۔

شارجہ میں کام کرتے ہوئے مجھے پانچ سال ہوئے ہوں گے کہ وہاں کرکٹ ٹورنمنٹ کا شاندار انعقاد عمل میں آیا۔ میرا باس جو برطانوی تھا اور فطری طور پر کرکٹ کا شیدائی تھی۔ اچانک ٹورنمنٹ دیکھنے پر تل گیا اور اس نے چھٹی لے لی۔ ساتھ ہی اس نے مجھے بھی چھٹی

دلائی اور ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا۔

ٹورنمنٹ دیکھنے کے لیے اطراف و اکناف کے عربوں کے علاوہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک غیر معمولی بھیڑ تھی۔ کئی کروڑ پتی (لکھ پتی ہونا تو اب معمولی بات ہوگئی!) بلکہ ارب پتی حضرات، بڑی بڑی نامور شخصیتیں، گلیمر بوائز اور گرلز، مشہور فلمی ستارے ہندوستان اور پاکستان دونوں طرف کے اس ٹورنمنٹ کو زینت بخشتے ہوئے تھے۔

ٹورنمنٹ تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل یہ (Show-off) کرنے کا ایک بہترین موقع تھا۔ ہزار طرح کی دلچسپیاں اور لاکھوں جلوے تھے۔ وی۔ آئی۔ پی انکلوژر، مرکز نظر بنے ہوئے تھے۔ جہاں دنیا کے چند بے حد خوش قسمت لوگ اپنے ماحول کو جنت نما بنائے ہوئے دادِ عیش دے رہے تھے۔ میرے باس کو اچانک انہی انکلوژرس میں کسی عرب رئیس سے ملنے کا خیال آیا اس نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ اس دن ہندوستان اور پاکستان کا کرکٹ میچ تھا۔ بڑا کھنچاؤ اور غل غپاڑہ تھا۔ دونوں طرف کے شائقین کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس شور و غل میں، میں نے اپنے باس کو اس عرب رئیس کے انکلوژر میں چھوڑا اور باہر آکر سگریٹ پینے لگا۔

اچانک بجلی کا سا جھماکا ہوا۔ بازو کے انکلوژر سے ایک شخص تیزی سے نکلا۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں ایک دوسرے کو بس دیکھتے رہ گئے۔ پھر اس کے چہرے پر ایک مانوس مسکراہٹ نمودار ہوئی جو دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں تک پہنچ گئی۔ پھر ہم دونوں لپٹ گئے۔ یہ سہیل تھا! اب وہ کسی قدر موٹا ہوگیا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک تھی۔ بھڑکیلے سوٹ میں ملبوس۔ سر کے بال سامنے سے تھوڑے تھوڑے غائب ہوتے جارہے تھے۔ ''یار تم ادھر کیسے آگئے؟ امی اور ابا کیسے ہیں؟''

میں نے کہا ''سب ٹھیک ہیں'' پھر اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا۔

''ابو کا اچانک دل کا دورہ پڑنے سے دو برس قبل انتقال ہوگیا۔ امی اچھی ہیں۔ باجی کالج میں پڑھاتی ہیں اور ان کے شوہر بھی کالج ہی میں ہیں۔ عقیل کسی بنک میں کام کرتا ہے۔''

''لیکن یار! تم شارجہ کیسے آ گئے؟''میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ سب اللہ کی مہربانی ہے۔ میں بازو کے انکلوژر ہی میں ہوں چلو! بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے۔''اس نے کہا۔

''بازو کے انکلوژر میں؟ میں حیران ہو گیا۔''مگر۔ مگر یہ انکلوژر تو کسی پاکستانی فلمی شخصیت کا ہے!''

''ہاں بھئی''اس نے جلدی سے کہا۔''یار میں مشہور پاکستانی ایکٹرس انجم آراء کا پرائیویٹ سکریٹری ہوں۔ پاکستان کی سپر اسٹار ہے وہ! کیا سمجھے؟''

اور اس کے چہرے پر پھر وہی مانوس مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اب کے وہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں تک نہ پہنچ سکی!

☆☆☆

چھٹکارا

آج پھر وہی بات ہوئی۔ غوثیہ بی کو پھر مایوس لوٹنا پڑا۔ گھٹنوں کے پور پور سے اٹھتے ہوئے درد کو سہتے ہوئے جو ہر دم کے ساتھ بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے سڑک پر رینگ رہی تھی۔ ایک ایک انچ آگے بڑھنے کو رینگنا ہی کہا جا سکتا ہے! پھر سینے کی گہرائیوں میں کہیں کوئی ٹیس کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کی دھندھلا دینے والی آنکھوں میں جو آنسو بہت دیر سے جمع نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ رہے تھے' اب بہہ نکلے تھے اور اس کی ٹھوڑی کو بھگو رہے تھے۔

پچھلے آٹھ روز سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ روزانہ اس دن سے جب کہ وہ پہلی بار اے پی ایکسپریس میں بیٹھ کر' حیدرآباد سے دہلی آئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ بس ایک ہاتھ میں ایک لاٹھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک پرانا ٹین کا صندوق جس میں اس کا کل اثاثہ...... یعنی چند کپڑے' ایک کنگھی' تیل کی شیشی' صابن' تسبیح' چادر' توال اور سکینہ (اس کی بیٹی) کے بچے کے لیے کچھ پلاسٹک کے کھلونے ...... ہاں ...... چند ہزار روپے بھی تھے جو وہ سدی پیٹ میں اپنا چھوٹا سا مکان بیچ کر لائی تھی۔ صندوق کے ساتھ جب وہ لڑکھڑاتے ہوئے' ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلی تو اسے بھانت بھانت کے لوگوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ ایک دم پریشان ہوگئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔ تبھی کہیں سے ایک پولیس مین وہاں آنکلا اور اس نے ان لوگوں کو جو ٹیکسی اور آٹو ڈرائیور تھے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ اس نے پولیس والے کو دعائیں دی تھیں اور اس سے پاکستانی سفارت خانہ کا پتہ پوچھا تھا جو وہ ایک کاغذ پر لکھوا لائی تھی۔ اسے وہیں جانا تھا۔ پاکستان جانے کے لیے ویزا لینے کے لیے۔ پولیس والے نے ایک آٹو والے کو پتہ سمجھا کر اسے آٹو میں سوار کروا دیا تھا۔

پاکستان کے شہر کراچی میں اس کی اکلوتی بیٹی سکینہ اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ اس کی سسرال میں رہتی تھی۔ سکینہ سے ملے ہوئے اسے تین سال سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا تھا۔ یہ وقت اس نے جس طرح گزارا تھا یہ اس کا دل جانتا تھا۔ ڈیڑھ برس پہلے اس کے شوہر' جہانگیر

صاحب کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ خبر سن کر اس کی بیٹی تڑپ کر رہ گئی تھی لیکن وہ کچھ نہ کرسکتی تھی کیونکہ اس کے بچے کی پیدائش کے دن بالکل قریب تھے۔

شوہر کی موت کے بعد غوثیہ بی بالکل ہی اکیلی ہوگئی تھی۔ ایک ایک دن کاٹنا اس کے لیے عذاب ہوگیا تھا۔ رہ رہ کر اس دن کو کوستی جب کہ اس کی چہیتی بیٹی کی شادی اس کے شوہر کے بھانجے رضی احمد سے ہوئی تھی۔ رضی احمد کی ماں اس کے شوہر کی سگی بہن تھی اور پندرہ برس پہلے وہ پاکستان منتقل ہو چکی تھی۔ جب رضی احمد کی شادی کرنے کا انھیں خیال آیا تھا تو بہن کو اپنے بھائی کی بیٹی سکینہ کا خیال بھی آیا۔ سکینہ، بچپن سے بڑی گوری چٹی اور خوب صورت تھی۔ پھر اپنا خون تھا۔ بہن نے خطوط لکھ لکھ کر اپنے بھائی کو اس رشتے کے لیے راضی کر ہی لیا۔ غوثیہ بی نے ہزار مخالفت کی مگر جہانگیر صاحب نے کبھی اس کی بات مانی تھی جواب مانتے! ان کے بہنوئی نے کراچی میں موٹروں کا کارخانہ کھول لیا تھا جو چل نکلا تھا اور وہ بڑے خوشحال ہو گئے تھے۔ رضی احمد اسی کارخانے میں باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ دیکھنے میں اچھا خاصا تھا۔ جہانگیر میاں نے بیٹی کے جہیز کے لیے بہت کم روپیہ جمع کر رکھا تھا۔ بہن نے لکھا تھا کہ جہیز لینے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ وہ صرف لڑکی چاہتے تھے۔ بس جہانگیر صاحب بری طرح پھسل گئے تھے۔

آخر کار شادی ہو بھی گئی اور کچھ دنوں کے بعد ان کے بہن اور بہنوئی ان کی اکلوتی بیٹی کو لے کر پاکستان چلے گئے۔

غوثیہ بی کی زندگی ویران ہوگئی۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ ہر روز وہ سکینہ کو یاد کر کے خوب رویا کرتی تھی۔ روتے تو جہانگیر صاحب بھی تھے لیکن بیوی سے چھپ کر...... پھر ایک دن اچانک گرمی کے دنوں میں وہ واپس لوٹے۔ دو چار الٹیاں ہوئیں اور ڈاکٹر کے بلانے سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیارے ہوگئے!

باپ کی موت کی خبر سن کر سکینہ تڑپ اٹھی تھی۔ اپنے ماں باپ کو وہ بے حد چاہتی تھی اور دن رات ان کی سلامتی کی دعا مانگتی رہتی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کی ماں کی کیا حالت ہوگی۔ یہ سوچ سوچ کر وہ گھنٹوں روتی رہتی۔ آخر کار اس کی ساس اور شوہر سے اس کا یہ حال دیکھا نہ گیا۔ انھوں نے سکینہ سے خط لکھوایا کہ غوثیہ بی جلد از جلد پاکستان آجائے۔

لیکن غوثیہ بی کے لیے پاکستان ایک انجانی دنیا سے کم نہیں تھا۔ ایک جاہل گنوار دیہاتی عورت کے لیے حیدر آباد جانا ہی بڑا مشکل تھا کراچی تو بہت دور کی بات تھی! لیکن جانا تو اسے ضرور تھا چاہے کتنی مشکلیں اور تکلیفیں اس کے راستے میں کیوں نہ آئیں! پاکستان میں اس کے دل کا ٹکڑا، اس کی لاڈلی بیٹی رہتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اڑ کر پل بھر میں کراچی جا پہنچتی! لیکن وہ ایک بوڑھی، کمزور اور بیمار عورت تھی جسے اپنے گھر کے باہر کی دنیا کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ۴۸ برس پہلے سیاست کے بے رحم ہاتھوں نے ایک ملک کے دو ٹکڑے کر کے ہزاروں خاندانوں کے بیچ میں ایک کبھی نہ مٹنے والی لکیر کھینچ دی تھی۔ جس کی دونوں جانب کہیں ماں باپ تھے تو کہیں ان کی کوئی اولاد، کہیں بھائی تھے تو کہیں بہن اور کہیں چچا تھے تو کہیں پھوپھی۔ اور شادی بیاہ اور موت جیسے موقعوں پر ان کا ملنا دونوں ملکوں کے حالیہ آپسی تعلقات اور سیاست کے اتار چڑھاؤ پر منحصر تھا۔ غوثیہ بی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اس کا کراچی جانا اتنا آسان ہرگز نہیں تھا۔ جتنا سدی پیٹ سے حیدر آباد چلے آنا ہندوستان سے پاکستان جانے کے لیے ایک بے حد اہم چیز درکار تھی جسے ویزا کا نام دیا جاتا ہے۔ ویزے کا حاصل کرنا بہت مشکل تھا اور یہ بے حد تھکا دینے والی اور رلا دینے والی دفتری کارروائیوں سے گزرنے کے بعد ہی ممکن تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر ملک کی تقسیم بے شمار انسانوں کے جذبات سے کھلواڑ کرتی رہی ہے اور بعد کے شکست و ریخت کی چکی میں دونوں حصوں کے عزیز و اقارب پس جاتے ہیں۔ یہی ہندوستان اور پاکستان میں ہوا۔ شمالی و جنوبی کوریا میں ہوا اور جب تک انسانوں کے دلوں میں نفاق کا بیج پلتا رہے گا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا!

سدی پیٹ کے ایک نیک نام وکیل سے مشورہ کر کے غوثیہ بی نے اپنا پاسپورٹ بنوایا تھا۔ اس کو بھی ایک سال لگا۔ اس دوران میں اس کے جوڑوں کے درد نے اس کا چلنا پھرنا حرام کر دیا تھا، آنکھیں بھی دھندلی ہو گئی تھیں اور اب وہ قدم قدم پر ہانپنے لگی تھی۔ پھر کسی نے اسے سمجھایا کہ اب وہ سیدھے دہلی چلی جائے۔ وہیں اس کو ویزا بھی مل جائے گا اور جانے کی اجازت بھی۔ اپنا چھوٹا سا گھر ایک جانے پہچانے آدمی کو بیچ کر وہ حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔ شرفو کا بیٹا ہاشم اسے حیدر آباد تک چھوڑنے ساتھ آیا تھا۔ ہاشم کو حیدر آباد میں کچھ کام

بھی تھا۔اسی نے غوثیہ بی کو دہلی جانے کے لیے ٹرین میں بھی بٹھا دیا تھا۔

آٹو سے اتر کر غوثیہ بی نے کرایہ دیا اور کراہتے ہوئے اس عمارت کا جائزہ لیا جسے پاکستانی سفارت خانہ کہا گیا تھا۔ بڑی عالی شان عمارت تھی لیکن جب وہ قریب پہنچی تو گیٹ بند تھا۔ چوکیدار نے کہا کہ آفس بند ہے اور سویرے ہی کھلے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ چونکہ آج کل دونوں ملکوں کے دوسرے شہروں کے قونصل خانے بند ہیں اس لیے روزانہ تیس درخواستیں لی جاتی ہیں اور وہ بھی جو پہلے کاؤنٹر تک پہنچے ان ہی کی۔

غوثیہ بی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اب کہاں جائے؟ کہیں دور جا کر ٹھہر جانا اور پھر صبح تڑکے ہی یہاں آنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ سامنے ایک بڑا سا پارک نظر آ رہا تھا۔ غوثیہ بی نے سوچا کہ رات کی رات یہیں کہیں پڑاؤ ڈال دے۔ صبح تو جلد اٹھنا ہی ہے! وہ ادھر ہو لی۔ پارک کے اندر ہر طرف لوگ بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ اسے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ ٹرین میں اس نے پیٹ بھر کر کھایا ہی نہ تھا۔ پارک کے ایک سرے پر ایک ڈھابے والا چھولے اور پاؤ (بریڈ) بیچ رہا تھا۔ غوثیہ بی نے دام پوچھے۔ اس نے جلدی جلدی روٹی کھائی اور پانی پیا۔ ڈھابے والے سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس کی طرح بہت سے لوگ رات اسی پارک میں گزار دیتے ہیں۔ اگر کوئی پولیس والا آ جائے تو ان سے کچھ لے کر وہ چل دیتا ہے۔ غوثیہ بی نے اندر پارک میں ایک آدمی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی ویزے کے لیے بہار سے آیا ہوا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرنے کی سکت نہیں ہے۔ اسی لیے کئی اور لوگوں کی طرح پارک میں ہی اس کا بسیرا تھا۔ غوثیہ بی نے خدا کا نام لیا اور کونے میں اپنا صندوق سرہانے رکھ کر چادر اوڑھ لی!

تبھی سے وہ پارک میں ہی رہتی آئی تھی۔ کئی بار پولیس کے لوگ آئے اسے نکال دینے کی دھمکیاں بھی دیں۔ پھر کچھ روپے لے کر چلے گئے۔ روزانہ صبح چار بجے کے بعد پارک میں رہنے والے لوگ ہائی کمیشن آفس کی طرف دوڑ پڑتے اور قطار میں کھڑے ہو جاتے۔ روزانہ صرف تیس لوگوں کو جو سامنے ہوتے اپنی درخواستیں پیش کرنے کا موقع ملتا۔ باقی اپنی قسمتوں کو کوستے ہوئے اگلے روز کے انتظار میں واپس لوٹتے۔

غوثیہ بی روزانہ آنکھ کھلتے ہی اپنی گٹھیا کی ماری ٹانگوں کو سنبھال کر لاٹھی ٹیکتے ہوئے۔ کاؤنٹر

کی جانب تیزی سے پہنچنے کی کوشش کرتی لیکن دھکا پیل میں پہل کرنے والے تندرست لوگوں کے ریلے میں پیچھے رہ جاتی اور پھر اپنی قسمت کا ماتم کرتے ہوئے ایک اور مایوسی بھرا دن گزارنے پارک واپس لوٹتی کئی بار اس نے کئی لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ کسی طرح اس کی درخواست کاؤنٹر تک پہنچا دیں۔ یہہ اس کیلئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔سب بظاہر اس سے ہمدردی کرتے لیکن صبح ہوتے ہی وہ کسی کو پہچانتے ہی نہ تھے۔ ہر ایک کو اپنی ہی پڑی رہتی تھی۔

آج اس کو دہلی آئے ہوئے نواں دن تھا اور ابھی تک وہ ہندوستان ہی میں تھی۔ ویزا ملنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ آج تو اس کی جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ رہ رہ کر اس کی نظروں میں اپنی چہیتی بیٹی سکینہ کا چہرہ گھوم جاتا۔ اللہ! کیا وہ پھر سے اس چہرے کو دیکھ سکے گی؟ اگر اسے ذرا بھی پتہ ہوتا کہ بیٹی سے ملنا اتنا زیادہ مشکلوں سے بھرا ہوگا۔ تو کچھ بھی ہو جائے۔ وہ سکینہ کو کراچی جانے ہی نہیں دیتی! لیکن اب تو...... اچانک درد کی ایک شدید لہر اس کے سینے کے کسی گوشے سے اٹھی اور اس نے اس کے سارے وجود کو لرزا دیا۔ میرے اللہ! یہہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ گھسٹتے ہوئے سڑک کے کنارے تک پہنچی اور دھپ سے وہیں بیٹھ گئی۔ صندوق اور لاٹھی بازو پٹک دیئے۔ اس کے ہر مسام سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اور حلق بالکل ہی خشک ہو چکا تھا۔ حالاں کہ صبح کی خنکی ابھی باقی تھی۔ درد کی ایک اور لہر نے اسے دوہرا کر دیا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اچانک اس کے سارے جسم میں بھونچال سا آ گیا۔ اس سے پہلے کہ قریب کے لوگ اس کے اور قریب پہنچتے اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا اور آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔

غوثیہ بی کو پاکستان جانے کا ویزا تو نہیں مل سکا لیکن اوپر جانے کا ویزا مل گیا تھا!۔

☆☆☆

حادثہ

ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں گانے کا ریہرسل دوپہر سے چل رہا تھا اور اب ختم ہونے کو ہی تھا۔ ارینجر فرانسس لوبو' سازوں کے placement کے پیچھے ہلکان تھا۔ کبھی روم (Rhythm) سیکشن کی طرف بھاگتا تو کبھی اسٹرنگ (String) سیکشن کی طرف مشہور موسیقار جوڑی سبھاش چند ہیرالعل کا سبھاش چند اسٹوڈیو آیا تھا اور اوپر اپنے روم میں بیٹھا تاش کے پتوں سے اپنا دل بہلا رہا تھا۔ ہیرالعل اپنی نئی امپورٹیڈ بینز میں براجمان پان چباتے ہوئے' دوسرے میوزک ڈائرکٹروں کے ماں باپ کو نواز رہا تھا اور اس کے چمچے ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

اتنے میں شور ہوا کہ لتا جی آ گئیں۔ ہیرالعل نے فوراً پان کی بڑی سی پیک تھوکی اور بینز کا دروازہ کھول کر اندر کی طرف لپکا۔ سبھاش چند بھی اپنی بازی ادھوری چھوڑ کر میوزک روم میں آ گیا۔ ساتھ میں فلم کے پروڈیوسر بوٹا سنگھ ڈائرکٹر سنت رام اور گانے لکھنے والے جابر در بھنگوی بھی تھے جیسے ہی لتا جی کار سے اتریں پروڈیوسر اور ڈائرکٹر نے پھولوں کا بڑا سا ہار ان کے گلے میں ڈالا۔ سبھاش چند اور ہیرالعل نے بھی لتا جی کو گلاب کے ہار پہنا کر انہیں نمستے کی۔ لتا جی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔

کاریڈور مہمانوں سے بھرا تھا کیوں کہ یہ بوٹا سنگھ کی فلم کے پہلے گانے کی ریکارڈنگ تھی۔ لتا جی' سبھاش چند' ہیرالعل کے ساتھ ان کے روم کی طرف چلی گئیں تاکہ فون پر سنائی ہوئی دھن کی تصدیق دونوں کے سامنے سنا کر کرلیں۔ یہ ایک بھجن کی دھن تھی۔ لتا جی نے بڑی شردھا سے کمرے کے ایک کونے میں لگی ہوئی گنیش جی کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑے' سر کو جھکایا اور آ کر سبھاش چند اور ہیرالعل کے سامنے بیٹھ گئیں۔ ہیرالعل نے پیٹی (ہارمونیم) کو پرنام کیا۔ لتا جی سے اجازت لی اور پیٹی بجانی شروع کی۔ سبھاش چند ہیرالعل کے چیف اسسٹنٹ رمیش گروور نے طبلہ سنبھالا۔ اسی لمحے فوٹو گرافر اندر آ گئے۔ انھوں نے پروڈیوسر ڈائرکٹر گیت کار اور

سبھاش چند ہیرالعل کے ساتھ لتا جی کو کھڑا کردیا۔ بہت سے فوٹو لیے گئے جب فوٹو گرافر باہر آگئے تو پھر بیٹھک جمی۔

لتا جی نے گانا شروع کیا۔ ہیرالعل اور رمیش چند گروور سنگت کرتے رہے۔ باہر کھڑے ہوئے لوگ سر ہلا کر کولڈ ڈرنک پیتے اور پیڑے کھاتے رہے۔ دھن کی تعریف کرنے لگے۔ دھن واقعی اچھی تھی۔۔ بہت عرصے کے بعد ایک ایسی دھن بنی تھی جو نہ صرف کانوں کو بھلی لگتی تھی بلکہ اس کے ہٹ ہونے کا بھی سب کو یقین تھا۔ یوں بھی سبھاش چند ہیرالعل کی سب دھنیں بہت مقبول ہوتی تھیں اور اگر نہ بھی ہوتیں تو بنادی جاتی تھیں۔ ان کے نام کا ڈنکا ساری فلم انڈسٹری میں بج رہا تھا۔ اب تک انہیں کئی گولڈ اور پلاٹینم ڈسک' ایچ ایم وی والوں کی طرف سے مل چکے تھے۔ ان میں کئی ڈسک تو فلم کی ریلیز سے پہلے ہی انھیں پیش کیے جاچکے تھے۔ ملک کے بچے بچے کی زبان پر ان کی بنائی ہوئی دھنیں تھیں۔ فلم انڈسٹری میں ٹیم ورک کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی لئے موسیقی ''بنانے'' (تخلیق کرنا' اب قصے کہانیوں کی بات ہوگیا) کا کام موسیقاروں کی ٹیم ہی اچھی طرح نمٹا سکتی ہے۔ آخر دو دو تین تین درجنوں فلموں کی موسیقی دینا ایک عام آدمی کے بس کی بات تو ہے نہیں۔ جس طرح تجارت میں کامیابی کے لیے ایک سے زیادہ پارٹنر ضروری ہیں۔ اسی طرح فلمی موسیقی کی تجارت کی بقا کے لیے موسیقار جوڑیاں لازم ہیں اس ڈھنگ سے کام بھی بٹ جاتا ہے اور گانے بھی سکوں کی طرح ڈھلے ڈھلائے اس پارٹنر شپ کی ٹکسال سے باہر آتے رہتے ہیں اور پھر سکوں کی طرح ہی چھنا چھن عوام میں چلنے لگتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے کہ کون سی دھن کس کی ہے؟ اس کی پرواہ بھی کسے ہوتی ہے جب کہ ہر دھن چلتی نہیں بلکہ بھاگتی ہے۔

لتا جی کا ریہرسل دس منٹ میں ختم ہوگیا۔ اور واہ واہ کے شور میں لتا جی دونوں موسیقاروں کے ساتھ ریکارڈنگ روم کی طرف بڑھیں۔ اتنے میں فلم کے ہیرو ستیش کھنہ کو کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے جانا تھا۔ وہ چلے گئے تو پھر ریکارڈنگ بوتھ میں لتا جی کی تان ابھری۔ سبھاش چند ان کے ساتھ تھے اور ہیرالعل ریکارڈنگ روم میں ارینجر لوبو اور رمیش گروور کے ساتھ سازندوں کو ہدایت دے رہے تھے۔

دو سو سازوں نے اچانک لہرا کر ریکارڈنگ روم کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ لتا جی کی تان کے بعد مکھڑا شروع ہوا۔ شہد جیسی مٹھاس ہوا میں رچ گئی۔ پھر انترے کی باری آگئی۔ اسی لمحے ہیرالعل نے آرکسٹرا روک دیا اور لوبو سے جھنجھلا کر کہا۔ ''ارے یار' یہ اسٹرنگ سیکشن میں کیا گڑبڑ ہے؟ وہ منڈولن بج کیوں نہیں رہے ہیں؟ ذرا دیکھو تو جا کر۔''

لوبو بھاگ کر اسٹرنگ سیکشن کی طرف گیا اور منڈولن بجانے والے گروپ میں بیٹھے ہوئے ایک سینئر آدمی سے بولا ''پرکاش چندر جی' کیا بات ہے؟ منڈولین کا ساؤنڈ ہی نہیں آتا؟ کیا گڑبڑ ہے؟''

پرکاش چندر جی نے اپنے بالوں سے عاری سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے ''تم کو بھیجہ ہو تو تم مائیک کی والیوم بڑھانا۔ ہم سے کیا پوچھتا ہے کیا گڑبڑ ہے؟ تم کو ارینجر کون گدھا بنایا؟''

لوبو غصے میں دانت پیستا ہوا مائیک ٹھیک کرنے میں لگ گیا۔ پاس بیٹھے ہوئے منو بھائی ڈیسائی سربہار والے نے پرکاش جی سے کہا۔

''پرکاش جی' تم کو سب کے سامنے لوبو کا کچرا کرنا نہیں مانگتا۔ وہ سالا اب لفڑا کرے گا۔ پھر تم کو اگلی بار نہیں بلائے گا ریکارڈنگ پر۔''

پرکاش جی بولے ''ارے نہیں بلائے گا تو کیا ہمارا بھاگ لے جائے گا۔ ہم تو جو بات سچی ہے وہی برابر بولے گا۔ اس کو برا لگے گا کہ بھلا۔ یہ لوبو کا سالا باپ ہمارا پاس منجیرے بجاتا تھا' منجیرے...... سمجھا؟ اس کو کیا معلوم میوزک میں کیا ہوتا ہے؟ اور یہ ہیرالعل کا باپ ہمارا آرکسٹرا میں پیٹی بجاتا تھا۔''

جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو سبھاش چند ہیرالعل نے لتا جی کو آرکسٹرا کے ساتھ سنا۔ پھر ریکارڈنگ شروع ہوئی جو رات کے نو بجے تک چلتی رہی۔ بیچ کے وقفے میں پرکاش چندر جی چارمینار سگریٹ پیتے رہے اور بری طرح ہانپتے رہے۔ نو بجے گانا ختم ہو گیا تو لتا جی سب کو نمستے کر کے گھر چلی گئیں۔ سبھاش چند ہیرالعل اپنے روم میں جا کر شراب سے دل بہلانے لگے۔ سب سازندے اپنا اپنا معاوضہ لے کر زور زور سے باتیں کرتے ہوئے باہر نکلنے لگے اور اسی وقت ایک حادثہ ہو گیا۔ پرکاش چندر جی' دروازے سے نکلتے نکلتے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اس

سے پہلے کہ ڈاکٹر کو بلایا جاتا ان کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

سارے سازندے اور اسٹوڈیو کے کارکن پرکاش چندر جی کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

گٹار بجانے والے واچہ نے کہا۔ ''پہلے تو کبھی نہیں سنا تھا کہ پرکاش دادا کو ہارٹ ٹربل تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟''

طبلہ نواز ترویدی جی بولے ''ارے یار' ایک زمانے میں ٹاپ کے میوزک ڈائرکٹر تھے۔ آج در بھاگیہ نے انہیں مینڈولن بجانے والا بنا دیا تھا۔ ایک ہی لڑکا تھا وہ بھی دو سال پہلے ایکسیڈنٹ میں مر گیا۔ تب سے یہ بڑے پریشان تھے اور تب ہی فلم آرکسٹرا میں آ گئے۔ پریشانیوں نے ان کی جان لے لی۔''

''نہیں''۔ منو بھائی ڈیسائی آنکھوں میں آنسو لیے بول پڑے۔ ''نہیں'' یہ بیٹے کی شاک سے نہیں مرے۔ میں بتاتا ہوں اصل بات کیا ہے؟ یہ جو دھن آج ریکارڈ ہوئی ہے اس میں اور پرکاش چندر جی کی فلم ''درد دل'' کا وہ گانا ''بڑی دیر لگا دی بلما'' میں کوئی انتر ہے؟ اس گانے اور آج کے گانے میں؟ اور در بھاگیہ دیکھو' اپنی بنائی دھن کے ساتھ آج ان کو ایک کلاکار کا مافک آرکسٹرا میں مینڈولن بجانا پڑا۔ اس سے بڑا شاک اور کیا ہو سکتا ہے بھائی؟ یہی کارن ہے ان کے اچانک مر جانے کا۔''

☆☆☆

چراغ صبح دم

آفریدی لاہور سے بمبئی اداکار بننے کے لیے آیا تھا۔ وہ تھا بھی ہیرو بننے کے قابل۔ اونچا قد، تیکھے نقوش، سرخ و سپید رنگت، بھاری آواز۔ کپڑے بھی بڑے سلیقے سے پہنتا تھا۔

لاہور میں، کچھ تھیٹریکل کمپنیوں میں، اس نے چند ڈراموں میں ہیرو کے رول کیے تھے۔ اسے امید تھی کہ بمبئی میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق، ہیرو اور ہیروئن کے لیے اپنے گانے خود ہی گانا ضروری تھا۔ وہ اس معاملے میں بھی خوش قسمت تھا کیوں کہ خدا نے اسے بڑی پرکشش آواز دی تھی۔ وارث شاہ کی کافیاں اور ٹپے وہ بڑے مزے لے لے کر گاتا تھا۔ لیکن بمبئی کی فلمی سرزمین، صوبہ سرحد میں واقع اس کے موروثی قصبے سے بھی زیادہ سنگلاخ ثابت ہوئی۔

ناگپاڑے کی ایک گندی اور اندھیری کھولی میں راتیں گزار کر صبح سے رات گئے تک وہ مختلف پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا لیکن کھوکھلے وعدوں کو سوا اسے کچھ نہ ملا۔ آخر آٹھ مہینے کی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد پروڈیوسر بھونانی کی ''ہیر رانجھا'' میں اسے ہیرو کے رول کے لیے چن لیا گیا۔ دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور وہ پہلی فرصت میں ناگپاڑے کی گندی کھولی سے پیچھا چھڑا کر اسٹوڈیو کے قریب ہی ایک چال میں پینگ گیسٹ کے طور پر ایک یہودی فیملی کے ساتھ رہنے لگا۔

فلم شوٹنگ شروع ہوگئی اور تین مہینے تک لگاتار چلتی رہی۔ لیکن ایک دن اچانک فلم بنی بند ہوگئی۔ پتہ چلا کہ فینانسر اور پروڈیوسر کا جھگڑا ہوگیا ہے کوئی اور پونجی پتی اس فلم کو ہاتھ لگانے کو تیار نہیں ہے۔

آفریدی پھر بے کاری کا شکار ہوگیا۔ ان دنوں وہ اکثر شام کو اندھیری چلا جاتا، جہاں ماسٹر غلام حیدر کا فلیٹ تھا۔ ماسٹر غلام حیدر فلموں کے مشہور میوزک ڈائرکٹر اور فلموں میں پنجابی انگ

کے خالق تھے۔ ان کی بیٹھک میں روزانہ موسیقی کا دور چلتا ایسی ہی ایک محفل میں آفریدی نے بھی ایک غزل سنائی۔ ماسٹر صاحب پھڑک اٹھے۔ بولے "ارے یار' تم تو چھپے رستم نکلے! کیا کھرج کی آواز پائی ہے! واہ واہ' جلد ہی ماسٹر غلام حیدر نے فلم "ڈولتی نیا" کے لیے اس کا ایک گانا ریکارڈ کرایا۔ یہ زمانہ پنکج ملک اور سہگل کے عروج کا تھا۔ بنگالی رنگ چاروں طرف چھایا ہوا تھا اور سہگل کی لافانی آواز کا جادو بھی اسے زائل نہ کرنے پایا تھا۔ ایسے میں پہلے نور جہاں اور شمشاد اور پھر آفریدی کی آوازوں نے فلمی موسیقی کو ایک نیا آہنگ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے' آفریدی کی آواز ملک کے کونے کونے میں گونجنے لگی۔ رومانی گیتوں میں اس کے گلے کا گداز بڑا غضب ڈھاتا تھا۔ برسوں میں پہلی بار ایک ایسی آواز مقبول ہوئی تھی جس کا مالک پردے پر فلم کا ہیرو نہ تھا۔ سب ہی مانے ہوئے موسیقار اب اسے اپنی ہدایت میں گوانا ضروری سمجھنے لگے۔ آفریدی نے ہیرو بننے کا خیال ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دیا اور ملک کا مقبول گائک بن گیا۔

خوش حالی کا دور آتے ہی آفریدی نے باندرہ کے کرسچن کوارٹر میں وکٹورین ٹائپ کا ایک خوبصورت سا بنگلہ خرید لیا جس کے بڑے سے لان اور پیچھے' آم' جامن اور پیپل کے درختوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے دیکھ کر اسے اپنے وطن کے ہرے بھرے باغات اور لہلہاتے ہوئے کھیت یاد آجاتے۔ دولت کی ریل پیل نے اسے شراب کا بھی عادی بنا دیا اور شام کی بیٹھکوں میں رمی بھی رس گھولنے لگی۔ اب اس کی زندگی میں ایک ہی کمی تھی۔ خوب رو ہونے کے باعث یوں تو کئی خوب صورت عورتوں سے اس کے چھوٹے موٹے "معاملے" رہ چکے تھے' لیکن دیہاتی زندگی کے خمیر میں گندھا ہوا' اس کا وجود رنگ برنگی تتلیوں سے دل تو بہلا سکتا تھا' لیکن ان میں سے کسی کو اپنے گھر کی بہار بنانے کی بات وہ کبھی سوچ بھی نہ سکا۔

ایک بار آفریدی مشہور فلم ساز راز دار کی فلم مہورت کے موقع پر اسٹوڈیو گیا۔ مہمانوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اوسط قد کی یہ لڑکی جس کے بال گھٹنوں تک پہنچتے تھے' اپنے بڑی بڑی خوب صورت اور نشیلی آنکھوں' ستواں ناک اور بھرے بھرے گداز ہونٹوں سے سجے ہوئے اپنے بیضوی چہرے کو اپنی ہتھیلی پر رکھے' بڑے دلنواز انداز

سے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے اس کے گالوں میں جو خفیف سے گڑھے پڑ گئے تھے ان میں آفریدی کا دل ڈوب ڈوب گیا۔

آفریدی نے ڈائرکٹر راز دار کے اسسٹنٹ ظہیر سے جو اسے جانتا تھا' اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔

''وہ لڑکی؟'' ظہیر نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا ''نئی چڑیا ہے۔ بھائی راز دار صاحب کہیں سے پکڑ لائے ہیں۔ سنا ہے پٹیالہ کی کسی ڈیرہ دار طوائف کی بیٹی ہے۔ اسے اس فلم میں سائڈ ہیروئن کا چانس دے رہے ہیں۔''

آفریدی کا دل ایک دم بجھ گیا۔ طوائف کی بیٹی! لاحول ولا! توبہ ٹوٹی بھی تو ٹوٹے ہوئے پیمانے سے' لیکن یہ چہرے کی معصومیت' یہ بھولپن' یہ گالوں میں بے ساختگی سے پڑ جانے والے گڑھے...... واہ خدایا! کیا تیری شان ہے! پھر بھی آفریدی نے اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دیا اور مہورت کے پیڑے کھانے میں مشغول ہو گیا۔

کچھ دن بعد' آفریدی کے دوست جگ موہن مشرا نے جو فلموں کی پبلیسٹی کیا کرتے تھے' اپنے بچے کے مونڈن کی رسم کے سلسلے میں اپنے گھر پر دعوت کی اور چونکہ راز دار صاحب کی فلم کی پبلیسٹی بھی وہی کر رہے تھے۔ اس لیے ان کی نئی فلم کے سب ہی اداکار اور یونٹ کے کچھ لوگ بھی مدعو تھے۔ وہیں مشرا نے اس لڑکی سے آفریدی کا باقاعدہ تعارف کرایا۔ شیریں نے کالے جارجٹ کی پھول دار بیل والی ساڑی پہن رکھی تھی اور اس کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ جب آفریدی نے اس کو بولتے ہوئے سنا تو اس کے موسیقی کے رسیا کانوں کو یوں لگا جیسے سارنگی پر کسی ماہر کے ہاتھ نے گز لہرا دیا ہو۔ ساتوں سُر اس کے گلے میں کروٹیں لے رہے تھے۔

اس رات اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوششوں کے باوجود آفریدی بے اختیار ہو کر بار بار شیریں سے باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس کھنچا چلا گیا۔ شیریں کی باتوں میں بھی بلا کی سادگی اور رچاؤ تھا۔ وہ غور کرتا ہی رہ گیا کہ ان باتوں میں حقیقت کتنی تھی اور اداکاری کتنی۔ پارٹی ختم ہونے پر آفریدی جب جانے لگا تو اس نے شیریں کو دوسرے دن چوپاٹی کے ایک ریسٹورنٹ میں ساتھ چائے پینے کی دعوت دی جسے تھوڑے سے تامل کے بعد شیریں نے قبول کر لیا۔

چوپاٹی پر گزاری ہوئی وہ شام' آفریدی کے لیے ایک یادگار شام ثابت ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ شیریں نے اس کے اصرار پر اپنا ماضی اس کے سامنے ایک کتاب کی طرح کھول کر رکھ دیا۔ یہ غلط نہیں تھا کہ وہ ایک طوائف کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ پٹیالہ کی ریاست میں اس کا خاندان کئی نسلوں سے لوگوں کا دل بہلاتا رہا تھا لیکن وہ اپنی ماں کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی ہونے کے باعث اپنے گھر پر ہی تعلیم حاصل کرتی رہی۔ پتہ نہیں یہ تعلیم کا اثر تھا یا یہ کہ وہ فطری طور پر باغی واقع ہوئی تھی۔ بہر حال ہوا یہ کہ ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے اپنے آبائی دھندے کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ بچپن سے وہ فلمیں دیکھتی اور پسند کرتی رہی تھی۔ مجبوراً ماں اسے لاہور لے گئی۔ لاہور میں جب بات نہ بنی تو پروڈیوسر آغا گل کا ایک سفارشی خط لے کر' شیریں راز دار صاحب سے ملی' جنھوں نے اسے فلموں میں کام دینے سے پہلے اسے رقص اور اداکاری کی تربیت دلانے کا انتظام کیا۔ اسی دوران اس کی ماں کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ چند مہینے کے بعد ہی راز دار صاحب نے اپنی نئی فلم میں اسے سائیڈ ہیروئن کا چانس دے دیا۔ اب فلم بہت تیزی سے بن رہی ہے۔

آفریدی نے اپنے دل میں شیریں کے لیے بے پناہ ہمدردی محسوس کی۔ ایک بے یار و مددگار خوبصورت لڑکی اپنے ماضی سے بغاوت کر کے بمبئی کے اس بھیانک جنگل میں بھٹک آئی تھی۔ نہ جانے کتنے درندے اسے نوچنے کھسوٹنے کے لے اپنے ناخن تیز کر رہے ہوں گے۔

ڈوبتے ہوئے سورج نے سمندر کی متلاطم لہروں میں پگھلا ہوا سونا گھول دیا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے الگ تھلگ وہ دونوں ریت پر دراز تھے۔ ریت کو اپنی مٹھیوں سے بکھیرتے ہوئے آفریدی نے دھیمے لہجے میں شیریں سے کہا ''میں بہت چھوٹا آدمی ہوں' لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ کیا تم میرا ہاتھ تھامنا پسند کرو گی؟''

شیریں نے اس کے پروقار اور سنجیدہ چہرے کو بڑے غور سے دیکھا۔ یہ آدمی جس کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش اور خلوص رچا ہوا تھا جس کی باتوں میں بچوں جیسی سادگی تھی...... کیا وہ اپنا مستقبل' اپنی خواہشیں اور اپنے خواب اس کے مضبوط ہاتھوں میں سونپ سکتی ہے؟

لیکن شیریں کی فلم کی تکمیل سے پہلے ہی ان دونوں نے شادی کر لی۔ سب سے عجیب

بات یہ تھی کہ فلم ''بدنام'' شیریں کی پہلی اور آخری فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم میں شیریں کے کام کی بڑی تعریف ہوئی تھی۔ عوام اور خواص دونوں نے اس کی فطری اداکاری اور پرکشش شخصیت کو بہت سراہا تھا اور اس فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی اس کے دروازے پر پروڈیوسروں کی لائن لگ گئی تھی۔ یہ لمحہ شیریں کے لیے بے پناہ مسرت اور اس کے خوابوں کی تعبیر لیے آیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ بھی کرنا تھا۔ کیوں کہ آفریدی نے شادی کی پیش کش کے ساتھ اس کے سامنے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ اسے شادی کے بعد اداکاری کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا پڑے گا۔

شیریں نے ایک شاندار فلمی مستقبل' آفریدی کی بیوی بننے کے لیے تیاگ کر دیا۔ ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ فلمی دنیا کے سبھی لوگ شریک ہوئے اور انھوں نے ایک نئی اور خوشگوار زندگی کے لیے دونوں کو آشیرواد دیا۔

شادی کے بعد دو برس خوشیوں کی رم جھم میں بھیگتے ہوئے گزرے لیکن آفریدی اپنی گھریلو زندگی کے ہرے بھرے گلزار میں ایک ننھے سے پھول کو کھلتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ دھیرے دھیرے مایوسی کی پت جھڑ نے اسے گھیر لیا۔ شہر کے نامی گرامی ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد یہ راز کھلا کہ شیریں بانجھ ہے اور اس کی گود ہمیشہ خالی ہی رہے گی۔ یہ انکشاف آفریدی کے لیے بڑا جاں گداز ثابت ہوا۔ اس صدمے کے اثر کو زائل کرنے کے لیے شادی کے بعد پہلی بار اس نے شراب کا سہارا لیا اور پھر شراب اس کے لیے ایک ضرورت بنتی گئی۔ زیادہ سے زیادہ وقت باہر گزارنے کا جتن کرنے کے لیے اب وہ پھر رمی بھی کھیلنے لگا اور جب رمی کھیلنے بیٹھ جاتا تو وقت کی رفتار اس کے لیے اپنے معنی کھو دیتی۔

راتوں کا مسلسل جاگنا آفریدی کی صحت پر اثر انداز ہوتا گیا اور اس کے مزاج میں چڑچڑاپن اور جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی۔ اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ شیریں پر برسنے لگتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود شیریں کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ روزانہ کی جھڑکیوں کو خاموشی سے سہہ لیتی اور گھر کے کام کام میں اپنے آپ کو مشغول رکھتی۔

آفریدی کی اندرونی ہلچل کا اثر اس کے پیشے پر بھی آہستہ آہستہ پڑنے لگا۔ کبھی کبھی

ریہرسل کے دوران وہ موسیقاروں سے بھی الجھنے لگا۔ ایک بار ایک نئی گائکہ اس کے ساتھ ایک دوگانے کی ریہرسل کر رہی تھی۔ ایک بول کو دھن کے مطابق گانے میں وہ ذرا سی غلطی کر گئی۔ آفریدی ایک دم آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے تمام سازندوں کے سامنے ایسے توہین آمیز انداز میں ڈانٹ دیا کہ وہ روتی ہوئی سیدھی باہر چلی گئی۔

ان ہی دنوں میں شیریں کی ایک بڑی بہن حسینہ اپنی نوخیز بیٹی شباب کے ساتھ جسے فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا' امرتسر سے بمبئی آ گئی۔ بمبئی جیسے بڑے اور بے رحم شہر میں رہنے کی جگہ تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے دونوں بمبئی آنے کے بعد ہی شیریں سے ملیں اور کوئی متبادل انتظام ہونے تک انھوں نے اس کے عالی شان بنگلے میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ شیریں' آفریدی کے مزاج سے واقف تھی۔ وہ اس کی رضامندی اور اجازت کے بغیر انہیں وہاں رکھ نہیں سکتی تھی۔ رات دیر گئے جب آفریدی اپنے دوستوں میں وقت گزار کر واپس لوٹا تو شیریں نے بڑے دھیمے لہجے میں بات چھیڑی اور اپنی بہن اور بھانجی کو کچھ دن کے لیے مہمان رکھنے کو کہا۔ یہ سنتے ہی آفریدی بھڑک اٹھا ''میرا گھر کوئی سرائے یا ہوٹل نہیں ہے۔ سمجھیں۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ انہیں کہیں بھی سر چھپانے کی جگہ مل سکتی ہے۔''

شیریں اس کے لہجے میں چھپی ہوئی حقارت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی ''لیکن یہ تو سوچو کہ فوراً انہیں رہنے کی جگہ کیسے مل سکے گی؟ اور پھر ہمارا گھر اتنا بڑا ہے۔ یہاں دو اور آدمیوں کے رہنے سے ہمیں کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟

آفریدی کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ٹھیک ہی تو ہے کچھ ہی دن کی تو بات ہے۔ کہیں نہ کہیں تو بعد میں ان کے رہنے کا بندوبست ہو ہی جائے گا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا ''لیکن میں انہیں یہاں اپنے بنگلے میں رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ باہر کمپاؤنڈ میں آؤٹ ہاؤس خالی ہے۔ وہیں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کر دینا۔''

''کیا!'' شیریں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''میری بہن' گیراج میں رہے گی؟''

''کیوں؟اس میں برائی کیا ہے؟'' آفریدی نے اونچی آواز میں کہا۔''اچھے خاصے روم ہیں۔ساتھ میں ٹائلیٹ بھی ہے۔بس انہیں وہیں رہنے کے لیے کہہ دینا'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شیریں بہت دیر تک آنکھوں میں بھر آئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے سوچتی رہی کہ کیا یہ وہی آدمی ہے جو مجھ سے کبھی بے پناہ محبت کرتا تھا؟ کیا اسی کے لیے میں نے ایک رنگین اور ارمانوں سے بھرپور زندگی پر ٹھوکر ماردی تھی ...... محض اس احساس کی وجہ سے عورت کی زندگی کی ابتدا اور انتہا اس کا اپنا گھر ہوتا ہے' جس کا محور ایک چاہنے والا شوہر ہو۔ بازار اور محفل سے گزر کر یہ راستہ اسے اس کے گھر میں لے آیا تھا اس کے لیے اب کانٹوں کا سیج کیوں بنتا جارہا ہے؟ لیکن اپنی بہن اور بھانجی کی بے کسی کو سامنے رکھتے ہوئے یہی بہتر تھا کہ توہین برداشت کرلی جائے اور آفریدی کے کہنے کے مطابق انہیں گیریج ہی میں جگہ دی جائے۔

دوسرے ہی دن سے شیریں کی بہن حسینہ اور اس کی بیٹی شباب' آفریدی کے گیریج میں رہنے لگیں۔ حسینہ دن بھر اپنی بیٹی کو ساتھ لیے اسٹوڈیوز کے چکر لگاتی رہتی۔ بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں سے کام دلانے کی التجا کرتی۔ شروع میں حسینہ نے شیریں سے بھی کہا تھا کہ شباب کو فلموں میں کام دلانے کے سلسلہ میں آفریدی کچھ مدد کردے لیکن شیریں نے اسے فوراً ٹوک دیا تھا۔ بھلا آفریدی جو اپنے گھر میں ان کے وجود سے ہی بیزار تھا' کیسے ان کی کہیں سفارش کرسکتا تھا۔

آخر شباب کو ایک نئے لیکن ہونہار ڈائرکٹر شیام سندر نے اپنی نئی فلم ''ساون'' میں سائیڈ ہیروئن کے رول کے لیے چن ہی لیا اور وہ روزانہ اسٹوڈیو جاکر اداکاری اور رقص کے رموز سیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جیسے جیسے فلم بنتی گئی' شباب کی نشیلی آنکھوں اور الھڑ اداکاری کے بارے میں فلمی دنیا میں سرگوشیاں پھیلتی گئیں۔اب کئی پروڈیوسر آفریدی کے گھر کے چکر کاٹنے لگے۔

ایک بار رات کے دو بجے جب آفریدی رات کا کھانا کھانے کے بعد سونے کی تیاری کررہا تھا تو اچانک باہر پھاٹک پر کسی کا ہارن زور زور سے بجنے لگا اور پھر بجتا ہی رہا۔ آفریدی کا نوکر

عبدل بھاگ کر گیا تا کہ معلوم کرے کہ کون آیا ہے۔

آفریدی کو خیال آیا کہ اس کے رمی کے ساتھی سیٹھ مگن لال نے حسب وعدہ اپنے ڈرائیور کے ہاتھ اسکاچ وہسکی بھیجی ہوگی۔ مگر عبدل واپس آکر بولا ''کوئی شیام سندر صاحب ہے۔ شباب بی بی سے ملنا چاہتا ہے۔

''شباب؟'' اچانک آفریدی کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ اوہو! تو اب یار لوگ راتوں کو بھی آنے لگے! وہ چیخا ''شیریں! شیریں!

شیریں برابر کے کمرے میں سو رہی تھی۔ نیند سے ایک دم بڑبڑا کر اٹھی اور ہال میں دوڑی دوڑی آئی۔

''باہر کوئی تمہاری بھانجی کے گاہک آئے ہیں۔ جاؤ بلا لاؤ انہیں۔

''کیا کہہ رہے ہو تو'' شیریں لرز اٹھی۔ پھر اس نے عبدل کی طرف پلٹ کر پوچھا ''کون ہے؟ کون آیا ہے عبدل؟''

''کوئی ڈائرکٹر بولتا ہے' شیام سندر صاحب۔'' عبدل رک رک کر بولا۔

''عبدل' تم جاؤ۔'' آفریدی گرج کر بولا۔ ''اور اس شریف آدمی سے کہہ دو' صبح کو آئے۔'' پھر شیریں سے مخاطب ہو کر اس نے کہا ''میں جانتا تھا کہ یہ گھر ایک دن رنڈی خانہ بننے والا ہے۔ اسی لیے میں نے تمہاری بہن اور بھانجی کو یہاں رکھنے سے منع کیا تھا۔ لیکن تم نہ مانیں اور اب رات گئے حلال زادے' اپنا منہ کالا کرنے اس گھر میں آنے لگے ہیں۔ بہت ہو چکا۔ یہ گھر کسی رنڈی کا کوٹھا نہیں ہے...... سمجھیں؟ اپنی چہیتی بہن اور بھانجی سے کہہ دو کہ کل ہی میرے گھر سے چلی جائیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم!'' شیریں غصے سے تھر تھر کانپنے لگی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ وہ فلم میں کام کر رہی ہے۔ کام کے سلسلہ میں ملنے والے تو آتے ہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سب خراب لوگ ہیں۔ آخر تم بھی تو اسی لائن کے آدمی ہو۔''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔'' آفریدی چیخ کر بولا۔ ''میں تم سے صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ اگر کل تک تمہاری بہن اور اس کی بیٹی نے میرا گھر نہیں چھوڑا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

بڑبڑاتا ہوا وہ اندر چلا گیا۔

شیریں سکتے میں رہ گئی۔ اس کے دماغ میں چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ یہ آدمی...... اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی اس سے شادی کر کے! کیسے اس نے اس آدمی کو اپنی ساری زندگی سونپ دی تھی۔! کیسے؟ رات بھر وہ سو نہ سکی۔ رات بھر اس کا تکیہ بھیگتا رہا اور آنکھیں جلتی رہیں۔

صبح کو اٹھنے کے بعد وہ اپنی بہن کے پاس گئی۔

''باجی! بھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا'' اب تم دونوں کو کوئی اور جگہ تلاش کر لینی ہوگی۔ یہ گھر تمہارے رہنے کے لیے اب مناسب نہیں رہا۔''

''مگر کیوں بے بی؟'' اس کی بہن بولی۔

''میرے شوہر تم دونوں کو یہاں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے اور نہ وہ تم لوگوں سے ملنے کے لیے آنے والے لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔ اگر تم واقعی چاہتی ہو کہ شباب ہیروئن بن جائے اور اس کا مستقبل شاندار ہو تو تم کو یہ گھر چھوڑنا ہی پڑے گا۔''

اس کی بہن ساری بات سمجھ گئی۔ دھیرے سے بولی ''ٹھیک ہے۔''

اس واقعہ کے تیسرے دن حسینہ اور اس کی بیٹی شباب ڈائرکٹر شیام سندر کے ایک فینانسر دوست کے فلیٹ میں منتقل ہوگئیں۔

چند ہی مہینے میں شباب کی پہلی فلم مکمل ہو کر ریلیز ہوگئی اور اس ایک ہی فلم نے اسے وہ شہرت بخشی جو کئی فلموں میں کام کرنے کے بعد بھی کچھ اداکاراؤں کے حصے میں نہیں آتی۔ سارے ملک میں اس کی اداکاری کی دھوم مچ گئی اور وہ جلد ہی اس چھوٹے سے فلیٹ سے نکل کر جوہو پر ایک شاندار بنگلے کی مالک بن گئی جس میں چار گیرج تھے۔ جن میں اس کی دو چمچماتی کاریں رکھی جاتی تھیں۔

آفریدی کو آہستہ آہستہ گانے کے مواقع کم ملنے لگے۔ اب وہ دن میں بھی پینے لگا تھا اور جوا اس کے لیے ہر وقت کی لت بن گیا تھا۔ بعض اوقات تو وہ چھتیس چھتیس گھنٹے تک رمی اور فلیش کھیلتا رہتا تھا۔ اسی طرح کی ایک نشست کے ختم پر وہ اپنی نئی بیوک بھی ہار گیا۔

شیریں بڑی خاموشی سے اپنے شوہر کے یوں بکھر جانے کا منظر بے بسی سے دیکھتی رہی۔

سمجھنا اب کوئی معنیٰ نہیں رکھتا تھا۔ آفریدی کے مقابلے میں اب کئی نئے اور زیادہ بہتر گانے والے آگے آ چکے تھے۔ اس لیے پروڈیوسر اور میوزک ڈائرکٹر اس سے کترانے لگے تھے۔ فلمی دنیا میں اتار اور چڑھاؤ' باہر کی دنیا کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مانوس چہرے پتھر کے ہیولوں میں بدل جاتے ہیں۔ مسکراہٹیں غائب ہو جاتی ہیں۔ پیروں تلے سے زمین کھینچ لی جاتی ہے۔

آفریدی کو پہلے گانے کم ملتے تھے پھر آہستہ آہستہ بالکل ہی بند ہو گئے۔ آواز کو شراب نے گہن لگا دیا تھا۔ سر کے ساتھ روپیے نے بھی بے وفائی کا شعار اختیار کیا۔ چنانچہ ایک دن لوگوں نے سنا کہ آفریدی کا بنگلہ بھی بک گیا۔

سنا ہے' آج کل آفریدی فلموں میں چھوٹے موٹے رول ادا کر کے بڑی مشکل سے اپنی روزی کماتا ہے۔ اب کسی فلیٹ میں رہنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے وہ اپنی بیوی شیریں کی بھانجی' مشہور فلم اسٹار شباب کے بنگلے کے ایک گیرج میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔

☆☆☆

یہ کیسی مسیحائی

ناشتے کے بعد' جب میں نے اخبار کی مقامی خبروں پر سرسری سی نظر ڈالی تو میں اچانک چونک گیا۔ جلدی جلدی میں نے وہ پوری خبر شروع سے آخر تک غور سے پڑھ ڈالی۔ مشہور گاسٹروانیٹرالوجسٹ (Gastro entrologist) ڈاکٹر ملہوترا کے دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا اور وہ اسپشیالیٹی ہاسپٹل' رائل ہاسپٹل میں شریک تھے۔

ایک عجیب سی سنسنی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے برقی کی ایک تیز رو' دوڑتے خون کے ساتھ میرے رگ و پے میں سے گزر گئی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک انجانی خوشی میرے سارے وجود کو سرشار کر گئی۔ شاید ایسی ہی خوشی' صدیوں پہلے حضرت موسیٰ نے' فرعون کے غرق نیل ہونے کے بعد محسوس کی ہوگی !

آج سے ایک برس پہلے کی وہ رات میری آنکھوں میں بجلی کی طرح کوندگئی جب دھواں دھار بارش میں' میں اور میری بیوی اپنے نوعمر لڑکے کو لیے ہوئے' ڈاکٹر ملہوترا کے کلینک گئے تھے۔ وہ بڑی قیامت کی رات تھی! پانی تھا کہ چھاجوں برس رہا تھا۔ میرے بیٹے کو جگر کا عارضہ تھا اور چلنا تو درکنار' اس کے لیے بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ کھانسی' مسلسل اس کے کمزور وجود کو تہہ و بالا کیے دے رہی تھی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے کسی طرح تابڑتوڑ بارش کے چھینٹوں سے اسے بچاتے ہوئے جب ہم کلینک کے بڑے سے ہال میں پہنچے تو وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بیٹھنے کی تک جگہ نہیں تھی۔ کسی طرح سے مریض کو ایک جگہ ہم نے بٹھا ہی دیا۔ میں ریسشپنسٹ (Receptionist) کی طرف لپکا۔

''معاف کیجئے' بیمار کی حالت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر کا اسے فوراً دیکھنا بہت ضروری ہے۔ پلیز! ہم کو اندر جانے دیں۔''

''آپ کا پہلے سے اپائنٹمنٹ ہے؟''

نہیں! ہمیں موقع ہی مل نہیں سکا۔ اچانک بچے کی حالت بگڑ گئی!

''Sorry! پھر تو آپ کو مریض کا نام لکھوانا پڑے گا۔ باری آنے پر ہی مریض کو آپ اندر لے جا سکیں گے۔'' اس لڑکی نے کورے لہجے میں جواب دیا۔

''میڈم! آپ سمجھتی نہیں ہیں! بچے کی حالت بہت خراب ہے۔''

''Sorry!'' اس نے پھر کہا...... ''میں کچھ نہیں کر سکتی۔ کلینک کے بھی کچھ اصول ہیں!''

میں اسے گھورتا ہی رہ گیا۔ مجبوراً بچے کی طرف لوٹ آیا۔ وہ اب بھی مسلسل کھانس رہا تھا۔ اس کا کمزور جسم' طوفان کی زد میں آئے ہوئے کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ہم دونوں اپنے آپ کو بہلانے کے لیے اس کا سر سہلاتے رہے۔ باہر تابڑ توڑ بارش ہو رہی تھی۔ مریض اور ان کے رشتے دار کیبن میں جاتے اور واپس' ایک کے بعد ایک آتے رہے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھیڑ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی ہے۔

اس دن سے دو مہینے پہلے بھی ہم بچے کو ڈاکٹر ملہوترا کے کلینک میں دکھلانے کے لیے لے آئے تھے۔ تب اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ جلد ہی اندر داخلہ مل گیا تھا۔ ڈاکٹر ملہوترا نے معائنہ کرنے کے بعد کہا تھا'' پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آپ بچے کو گورنمنٹ ہاسپٹل میں داخل کر دیجیے۔ میں وہاں گاسٹرو اینٹرولوجی ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ ہوں۔ میری نگرانی میں علاج ہوگا۔ بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

ہمیں بڑی ڈھارس بندھی تھی۔ دوسرے ہی دن ہم نے بچے کو گورنمنٹ ہاسپٹل میں داخل کر دیا۔ لیکن اسی دن ہمیں پتہ چلا کہ ڈاکٹر ملہوترہ' اسی صبح' کسی انٹرنیشنل سمینار میں شرکت کرنے کے لیے فلپائن جا چکے ہیں۔ وہاں سے جاپان اور ہونولولو کا دورہ کر کے شاید ایک مہینے کے بعد ہندوستان واپس لوٹیں گے۔ ہماری مایوسی کی انتہا نہ رہی لیکن کیا کرتے! مجبوراً بچے کو ہاسپٹل میں ہی رکھا۔ تب اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ چل پھر سکتا تھا لیکن روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ ہاسپٹل کے دوسرے ڈاکٹر' محض

ضابطوں کی تکمیل کر رہے ہیں۔ کئی قسم کے (test) وہ لیتے رہے اور اسی طرح ایک مہینہ گزار دیا۔ نہ تو صحیح تشخیص ہوئی نہ کوئی معقول علاج۔ کچھ دن اور ہم نے ڈاکٹر ملہوترا کی واپسی کے انتظار میں گزار دیے لیکن ان کا پتہ نہیں تھا۔ کوئی بھی ان کی واپسی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔

مجبوراً ہمیں مریض کو ڈسچارج کروا کر گھر لے آنا پڑا۔ پھر کسی کے کہنے پر ہومیوپیتھی علاج شروع کیا۔ وقتی طور پر کچھ حالت سنبھلی مگر کمزوری بڑھتی گئی۔ مسلسل بخار رہنے لگا۔ غذا کم ہوتی گئی اور اب پچھلے دو دنوں سے تو اس کی صحت میں ایک دم بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔

آخر کار، ہال میں دو تین ہی لوگ باقی رہ گئے۔ ہم نے بچے کو ایک بنچ پر لٹا دیا تھا۔ وہ بڑی تکلیف سے سانس لے رہا تھا۔ تبھی کاؤنٹر کلرک نے مجھے بلایا۔ مریض کا نام پوچھا۔ پھر فیس کی چٹھی پھاڑتے ہوئے بولی ”سو روپے دے دیجیے۔ ابھی آپ کی باری آئے گی۔“

دس منٹ کے بعد ہم بچے کو سہارا دیے ہوئے کیبن میں لے گئے۔ ڈاکٹر ملہوترہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا، ہمیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بچے کو قریبی بیڈ پر لٹا دینے کے لیے کہا۔ پھر اٹھا اور خاموشی سے بچے کا معائنہ کرنے لگا۔ معائنہ ختم کر کے بولا ”آپ لوگ اب تک کیا کر رہے تھے؟ سو رہے تھے؟ It is a hopeless case جائیے! اسکورائل ہاسپٹل لے جائیے۔ وہاں میں آتا رہوں گا۔ حالت بہت ہی serious ہے!“

”لیکن ڈاکٹر صاحب......“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا ”اس سے پہلے بھی آپ نے اسے ہاسپٹل میں داخل کرنے کے لیے کہا تھا لیکن آپ ایک بار بھی اسے attend نہ کر سکے اور اب پھر......“

”میں پہلے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا“ اس نے چڑچڑے انداز میں کہا ”آپ اس کو فوراً رائل ہاسپٹل لے جائیے۔“

”ڈاکٹر صاحب! کم از کم اس بار آپ سے امید ہے کہ آپ کی نگرانی میں بچے کا معقول علاج ہوگا۔ پچھلی بار تو آپ کے کہنے پر ہی ہم نے بچے کو ہاسپٹل میں داخل کروایا تھا لیکن

اس تمام عرصے میں آپ ملک کے باہر رہے اسی لئے بچے کا اب تک کوئی معقول علاج نہ ہو سکا۔ اسی لئے......''

''کیا مطلب؟'' وہ ایک دم بھڑک کر بولا ''معقول علاج؟ ہم لوگ ہمیشہ ہی معقول علاج کرتے ہیں۔ یہ آپ جیسے لاپرواہ لوگ ہیں جو اپنی جہالت سے مرض کو بگاڑ دیتے ہیں۔ جائیے! اسے رائل ہاسپٹل لے جائیے۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! ابھی تو بچے کی حالت بے حد خراب ہے۔ بہتری کے لیے کچھ تو کیجئے! کوئی انجکشن یا دوا۔ تاکہ اسے کچھ آرام ہو جائے۔''

''نہیں! نہیں!!' وہ چڑ کر بولا'' کچھ نہیں کر سکتا میں۔ کل اسے ہاسپٹل لے آؤ۔''

بوجھل قدموں سے ہم مجبوراً بچے کو لیے آٹو میں گھر واپس ہوئے۔ رات بڑے ہی عذاب میں کٹی۔ صبح بچے کو لیے رائل ہاسپٹل گئے۔ داخلے کے لیے کاؤنٹر پر جب میں پہنچا تو فارم بھرنے سے پہلے میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے ڈاکٹر ملہوترا کی ویزٹ کے بارے میں پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ملہوترا پندرہ دن تک ہاسپٹل نہیں آئیں گے کیونکہ وہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔

اس واقعے کے تیسرے دن میرے ہونہار اور نو عمر بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ زمین اور آسمان ہم پر تنگ ہو گئے۔ ہوش و حواس جواب دے گئے۔ وقت جیسے رک سا گیا...... یقین ہی نہ آتا تھا کہ ہمارے وجود کا ایک حصہ کیسے ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا! وہ جسے پیدائش سے اس کی جوانی کی دہلیز تک پہنچانے میں' ہمارے شب و روز وقف تھے کیسے ہمارے شب و روز سے غائب ہو گیا...... کیسے؟

ایک عرصے کے بعد ہوش آیا تو میرے جی میں آیا کہ جا کر شہر کے تمام ہسپتالوں کو آگ لگا دوں اور وہ انسان نما حیوان جو بیمار انسانیت کے علاج اور راحت کا دعویٰ کرتے ہیں' انھیں صفحہ ہستی سے مٹا دوں!

لیکن مجھ جیسا' ساری عمر قانون اور اخلاق کے دائروں میں مقید رہنے والا کمزور انسان کیا

کر سکتا تھا! میں کسی ہندوستانی فلم کا ہیرو تو نہ تھا جو انتقام کی آگ میں جھلس کر ہاتھ میں پستول لئے' اپنے تمام برا چاہنے والوں کا دیکھتے ہی دیکھتے' گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے' خاتمہ کر دیتا ہے۔ ایک حساس' لیکن قانون واخلاق کا پاس ولحاظ رکھنے والا شخص صرف کڑھتا رہ جاتا ہے۔ میں بھی کچھ نہ کر سکا! بس سوچتا اور کڑھتا رہ گیا کہ یہ سفید پوش مخلوق جسے عام آدمی مسیحا سمجھتے ہیں' انسانیت سے کتنی دور ہے! ان کا مقصد حیات صرف روپیہ کمانا ہے اور یہ روپیہ وہ اپنے مریضوں کو نت نئے ڈیا گناسٹک سنٹرس (Diognostic Centers) میں جہاں سے انھیں معقول کمیشن ملتا ہے۔ طرح طرح کے Tests کروا کر اور قیمتی دوائیں دے کر پیدا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو میڈیکل سائنس کی حیرت انگیز ترقی سے مریضوں کو صحت یابی بخشنے کے بجائے انھیں زیر بار کرتے رہتے اور انھیں آہستہ آہستہ موت کو دہانے کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ یہ آج کل کے مسیحاؤں کا اصلی روپ ہے! آج ہر وہ شخص جو میڈیکل پیشے میں داخل ہونے سے پہلے' اس کی تقدیس برقرار رکھنے کی ہپو کراٹس (Hippo Cratis) قسم کھاتا ہے اور انسانیت کی تمام عمر خدمت کرنے کا عہد کرتا ہے۔ عملی دنیا میں قدم رکھتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے اور ایک ایسی مشین میں تبدیل ہو جاتا ہے جو سکے ڈھالنے کا کام کرتی ہے۔

مجھے پتہ ہے کہ تمام ڈاکٹر' ڈاکٹر ملہوترا جیسے نہیں ہیں۔ ان میں یقیناً مریضوں کا خیال رکھنے والے اور امراض کو پہچان کر علاج کرنے اور صحت واپس لے آنے والے لوگ بھی ہیں لیکن میرے ہوش ربا تجربے نے مجھے ڈاکٹر ملہوترا کو ایک ایسی شخصیت کے روپ میں لا کر کھڑا کیا جسے مریضوں کے علاج سے زیادہ روپیہ کمانے اور نام وشہرت کے پیچھے بھاگنے کا جنون رہا ہے۔ نہ جانے اپنے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لیے اس نے کتنے مریضوں کی زندگیوں سے کھلواڑ کیا ہوگا! اپنی ہر لاپرواہی اور غلطی کو میڈیکل وجوہات کا لبادہ پہنا دیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے دلائل سے مریضوں کے رشتے دار وقتی طور پر مطمئن ہو گئے ہوں گے لیکن اس کا ضمیر (اگر اب بھی وہ ہے!) یقیناً ہر وقت اس پر لعنت بھیجتا رہا ہوگا! یقیناً...... کیوں کہ ڈاکٹر ملہوترا بھی ایک انسان ہے! اس کے ہزاروں مریضوں کی طرح ایک فانی جسم کا مالک۔ اس کے جسم میں

بھی وہی خون دوڑتا ہے جو دوسروں کی رگوں میں موجزن ہے اور وہ بھی اسی طرح کسی بھی مرض کا شکار ہو سکتا ہے جس طرح دوسرے بے شمار آدمی!

اچانک میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں ڈاکٹر ملہوترا کو دیکھنے جاؤں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ ایک خطرناک مرض کے آہنی پنجوں میں جکڑا ہوا' کسی باز کی شکار چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہوگا! کیسے اس کے اعصاب' اس کے دماغ کا حکم ماننے سے انکار کر چکے ہوں گے! کیسے اس کی حسرت ناک آنکھوں میں موت کا بھیانک سایہ ناچ رہا ہوگا! یہ سب کچھ میں دیکھنا چاہتا تھا اور میں ضرور دیکھوں گا!

جب میں رائل ہاسپٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ملہوترا انٹنسیو کیر یونٹ (Intensive care unit) میں ہے تو کمبخت واقعی Serious ہے!

بہت سے لوگ' کمرے کے باہر کھڑے تھے اور باری باری انھیں اندر جانے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ تو گویا کیو (queue) یہاں بھی' اس کے کلینک کی طرح موجود تھا! میں بھی اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

میں کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ ڈاکٹر ملہوترا چت لیٹا ہوا' کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا۔ ڈیکس ٹروز (Dextrose) کی باٹل چڑھائی جا رہی تھی۔ عینک کے بغیر اس کا چہرہ پہچاننا مشکل تھا۔ میں بستر کے پائنتی جا کر کھڑا ہو گیا۔ چھت کو گھورتے گھورتے ایک لمحے کے لیے اس کی نظر اچٹ کر مجھ پر پڑی اور الجھ کر رہ گئی۔ آنکھیں پہلے تو شیشے کی طرح شفاف رہیں۔ پھر ان میں پہچان لینے کی ایک رمق پیدا ہوئی اور پھر یہ دونوں آنکھوں میں پھیل گئی۔ میں اس لمحے ٹھٹھا مار کر' زور زور سے ہنسنا چاہتا تھا۔ قہقہے لگانا چاہتا تھا۔ یہاں بات کرنے کی ممانعت تھی لیکن میں چلا کر کہنا چاہتا تھا۔ "ڈاکٹر ملہوترا!!! یہی وہ منزل ہے جس سے ہر فانی انسان کو گزرنا ہے۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے جسے ہر انسان جھٹلانے کی تمام عمر کوشش کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتی! دیکھو! کل تک ہزاروں مریضوں کی تقدیریں تمہارے دماغ سے جڑی ہوئی تھیں لیکن آج یہ تمہارا غیر معمولی دماغ' گوشت کے بے جان لوتھڑے

سے زیادہ نہیں! اسی پر تو ناز تھا نا تمہیں؟

ڈاکٹر ملہوترا کی آنکھیں یک بیک سکڑ گئیں اور ان میں بے بسی کی ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ پھر بے کسی کے از حد احساس سے اس کی آنکھیں شرابور ہو گئیں۔ میں نے قہقہے لگانے کے جذبے کو کچل دیا...... پھر اچانک میرے دل و دماغ میں یک بیک سکون و راحت کا احساس در آیا۔ ایسا لگا جیسے میرے وجود کو جو پہلے تپتی ہوئی ریت پر گرا ہوا تڑپ رہا تھا کسی غیر مرئی طاقت نے اٹھا کر کسی ٹھنڈے پانی کی جھیل میں ڈبو دیا ہو! اس از حد سکون کے بطن سے ایک آواز ابھری جو شاید میری ہی آواز تھی لیکن کہیں دور...... اوپر ہماری قسمتوں کا امین ہے! وہی سب کا انصاف کرنے والا ہے۔ مکمل انصاف...... اس کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا! کوئی بھی نہیں!

میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

قیدِ تنہائی

میں گہری نیند میں تھا۔ اچانک میرے کانوں میں اپنی پوتی غزالہ کے رونے کی آواز آئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پاس کی تپائی پر سے اپنی عینک اٹھا کر آنکھوں پر لگائی اور بیڈ روم سے نکل کر اپنی بہو اسریٰ کے کمرے کی جانب لپکا۔ بند دروازے کو دیکھ کر میں سکتے میں آ گیا۔ دروازہ تو بند تھا بلکہ یہ تو چھ مہینوں سے بند تھا۔ میری بہو غزالہ کو لے کر کبھی کے اپنے میکے سدھار گئی تھی۔ پھر میں تھکے تھکے قدموں سے چل کر ڈرائینگ روم میں آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پاس کی میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹ غٹ پی گیا۔

آخر میں اب تک کیوں غزالہ کو اپنے دل و دماغ سے نہیں نکال سکا۔ وہ پیاری پیاری بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والی بچی، جو ہمارے گھر کی جان تھی کیسے ہم سے الگ ہو گئی؟ جبکہ دن رات دادا، دادا کہتے ہوئے اس کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ وہ اس کی پیاری پیاری باتیں، دل موہنے والی ادائیں اور وہ تیزی سے بھاگنا۔ ٹھوکر کھا کر گرنا اور پھر روتے ہوئے میری گود میں آ جانا۔ یہ سب میں کیسے بھلا پاؤں گا؟

یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا؟ آج سے چار سال پہلے ہم کتنے خوش تھے۔ تب میری مرحومہ بیوی بھی زندہ تھیں۔ ہمارے بیٹے عاطف کو جیسے ہی دوبئی میں نوکری مل گئی ہم نہال ہو گئے تھے۔ میری بیوی نے اس دن سے ہی عاطف کے لئے رشتوں کی تلاش شروع کر دی۔ حالانکہ وہ منع ہی کرتا رہا اور یہ کہتا رہا کہ ابھی میری تنخواہ اتنی نہیں ہے کہ میں شادی کے بعد اپنی بیوی کو ساتھ رکھوں لیکن میری بیوی نے ایک نہیں مانی۔ وہ تو بس جلد از جلد گھر میں خوشیاں دیکھنا چاہتی تھیں۔ میرج بیورو میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ اخبارات میں اشتہار دیے گئے۔ پھر لڑکیاں دیکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بیسیوں لڑکیاں دیکھ ڈالیں۔ بالآخر اسریٰ کو ہم نے پسند کر لیا۔ وہ دیکھنے میں جاذبِ نظر تھی۔ گریجویٹ تھی۔ خاندان بھی خوشحال تھا۔ دو بھائی مشرقِ وسطیٰ ہی میں برسرِ روزگار

تھے۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر کا سارا کاروبار ماں کے ہاتھوں میں تھا۔ رشتہ جب طے ہوا تو اسریٰ کی ماں، مجسم اخلاق بنی ہوئی تھیں۔ کس کو پتہ تھا کہ اخلاق کے اس پردے کے پیچھے ایک شر پسند دماغ بھی تھا۔

عاطف کو سب کچھ بتا دیا گیا۔ پھر وہ جب اگلے برس گھر آیا تو اس نے لڑکی بھی دیکھ لی اور ہماری پسند کی داد دی۔ میری بیوی یہ چاہتی تھیں کہ انہی دنوں شادی ہو جائے۔ لڑکے نے پہلے تو مخالفت کی لیکن بعد میں وہ راضی ہو گیا۔ اس نے اپنی رخصت بڑھا دی۔ اسریٰ کے دونوں بھائی بھی کسی طرح حیدر آباد آ گئے۔ ہم نے ان سے صاف صاف یہ بات کہہ دی کہ شادی کے بعد جب تک عاطف کو فیملی ویزا نہیں ملے گا وہ لڑکی کو دوبئی لے جا نہیں سکے گا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ پہلے ماں نے 'ہاں' نہیں کہی لیکن بیٹوں کے سمجھانے پر وہ بھی راضی ہو گئیں۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا گھر بہو سے سج گیا۔ عاطف بھی کافی خوش تھا۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ بعد میں ایک مہینہ کیسے گزر گیا۔ میری بیوی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بہو پر وہ وارے وارے جاتیں۔ اور جب عاطف چھٹیوں کے ختم ہونے پر بھرے ہوئے دل کے ساتھ دوبئی روانہ ہو گیا تو...... ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ہم تو مغموم تھے ہی۔ بہو بھی کئی دنوں تک گم سم رہی۔ کچھ ہی عرصے بعد اسریٰ کی ماں کا بلاوا آیا۔ وہ بیٹی کی جدائی سے پریشان تھیں۔ ہم نے خوشی سے ماں کے ہاں جانے کی اجازت دی تھی۔ ایک مہینے تک وہ ماں کے ہاں رہی۔ روزانہ فون آتا۔ ہماری خیریت پوچھتی۔ ایک مہینے بعد میری بیوی بے چین ہو گئیں انھوں نے کئی بار اسریٰ کو آ جانے کے لئے کہا۔ بالآخر ایک دن وہ آ ہی گئی۔ لیکن اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ میری بیوی نے کبھی اس سے گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے نہیں کہا تھا کیونکہ گھر میں نوکرانی موجود تھی۔ اسریٰ دن بھر کمرے میں پڑی رہتی۔ صرف کھانے کے لیے باہر آتی۔ کبھی کبھی شوہر سے بات کرنے کے لئے STD بوتھ چلنے کے لیے مجھ سے خواہش کرتی۔ اس کے بات کرنے کے بعد میں اور میری بیوی بھی عاطف سے بات کر لیتے۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد اسریٰ کی ماں نے فون کیا کہ رشتہ داروں میں کوئی شادی ہے اس لیے اسریٰ کو کچھ دنوں کے لیے بھیج دیا جائے۔ ہمیں بات کچھ عجیب معلوم ہوئی۔ پھر بھی ہم نے

اسریٰ کو ماں کے ہاں بھیج ہی دیا۔ اس شادی کی دعوت ہمیں بھی دی گئی تھی لیکن میری بیوی کی صحت اچانک خراب ہو جانے کی وجہ سے ہم جا نہیں سکے۔ اس بار بھی اسریٰ ایک مہینے تک واپس نہیں آئی۔ ویسے جب واپس آئی تو ایک خوشخبری ہمارے لیے لے آئی۔ وہ حاملہ تھی۔ ہم خوشی سے سرشار ہو اٹھے تھے۔ میری بیوی کی خوشی تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فون آیا تو پتہ چلا کہ عاطف بھی بے حد خوش تھا۔ اب اسریٰ کا ہر طرح سے خیال رکھا جانے لگا۔ میری بیوی اسے کوئی بھی کام نہیں کرنے دیتیں۔ چاہے وہ چھوٹا کام ہی کیوں نہ ہو۔ ایک اور مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ اسریٰ کی ماں کے دن میں کئی بار فون آتے۔ دیر تک بات ہوتی۔ ایک مہینے کے گزرنے کے ساتھ ہی اسریٰ کی ماں نے مجھے فون کر کے کہا کہ اسریٰ کی مناسب دیکھ بھال کے لئے وہ اپنے ہاں اسے بلانا چاہتی ہیں۔ پہلے تو ہمیں ذرا برا لگا لیکن اسریٰ کی مرضی کو بھی بھانپ کر ہم نے اجازت دے دی۔ اسریٰ چلی گئی۔ اس بار پہلے کی طرح اس کے فون روزانہ نہیں آتے تھے۔ ہفتے یا دو ہفتے میں ایک بار وہ بات کر لیتی۔ ہماری خیریت پوچھ کر اپنے بارے میں کچھ کہہ دیتی۔ پھر اچانک یہ اطلاع ملی کہ اسریٰ کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ہم دونوں خوشی خوشی وہاں پہنچے۔ دو گھنٹے بعد ہی ایک خوبصورت اور صحت مند بچی تولد ہوئی۔ ہم نے فوراً بیٹے کو اطلاع دی۔ وہ خوشی سے سرشار ہو اٹھا۔ اپنی بیٹی کے نام رکھنے کا معاملہ اس نے مجھ پر چھوڑ دیا۔ ہسپتال سے اسریٰ، ماں کے گھر ہی چلی گئی۔ وہاں اور تین مہینوں تک اس کا قیام رہا۔ ہم بچی کو دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے۔ بار بار جا نہیں سکتے تھے۔ اس لیے زیادہ تر فون پر ہی بات چیت ہوتی۔ آخر بیٹے کو جب رخصت ملی تو اس نے اسریٰ سے کہہ دیا کہ وہ ہمارے گھر آ جائے۔ اسریٰ کے آنے کے دو دن بعد ہی عاطف بھی حیدرآباد پہنچ گیا۔ ایک اور نوکرانی کو رکھ لیا گیا۔ اور وہ عرصہ بڑا ہی خوشگوار گزرا۔ عاطف، بیٹی کو دیکھ کر نہال ہو اٹھتا۔ ہم دونوں کی محبتوں کا محور بھی بچی ہی تھی۔ ایک مہینہ چٹکی بجاتے گزر گیا۔ عاطف کے روانہ ہونے کے ایک ہفتے بعد ہی اسریٰ کی ماں نے فون کیا کہ ان کی طبعیت خراب رہنے لگی ہے اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ اسریٰ ان کے پاس کچھ دنوں کے لیے آ جائے۔ اب ایک طرح سے یہ معمول ہو گیا۔ مہینے یا دو مہینے میں اسریٰ ہمارے ہاں آ کر رہتی اور پھر اپنی ماں کے ہاں چلی جاتی۔ اسی طرح

تین برس گزر گئے۔ میری بیوی کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ انہی دنوں ان کے قلب پر اچانک حملہ ہوا۔ ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ دس دن تک وہ وہیں زیر علاج رہیں۔ اسریٰ اپنی ماں کے ساتھ دو تین بار آئی۔ عاطف بہت پریشان ہو گیا تھا بلکہ وہ فوراً حیدرآباد آنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روکا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ خطرے کی گھڑی ٹل گئی ہے۔ آئندہ احتیاط کے علاوہ دواؤں کی ضرورت ہو گی۔ میری بیوی کے ہسپتال سے ڈسچارج کیے جانے سے پہلے اسریٰ اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے ہمارے گھر واپس آنے یا اپنی ساس کی دیکھ بھال کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا اور نہ اس کی ماں نے کوئی بات کہی۔ ہم دونوں کو اس بات سے کافی صدمہ پہنچا۔ لیکن میں نے بیوی کو سمجھایا کہ دیکھ بھال کے لیے میں موجود ہوں۔ ہم گھر چلے گئے۔ یہیں سے معاملہ بگڑ گیا۔ عاطف نے شاید اسریٰ سے بات کی اور اسے تاکید کی کہ وہ فوراً ہمارے گھر آ جائے۔ شاید ان یہ کہا ہو گا کہ ماں کی دیکھ بھال کے لیے اس کا گھر میں ہونا ضروری ہے۔ دوسرے ہی دن اسریٰ ہمارے گھر آ گئی لیکن اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ بجائے گھر کا کاروبار سنبھال لینے کے وہ دن بھر کمرے میں سوئی پڑی رہتی۔ صرف بچی سے اسے مطلب تھا جواب چلنے لگی تھی۔ کبھی دادی کے بستر پر چڑھ جاتی اور گود میں بیٹھ جاتی۔ کبھی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میرے پاس آ جاتی۔ اس کی پیاری پیاری مسکراہٹ ہمارے دلوں کو خوشی سے بھر دیتی۔ ہم اسے زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے لیکن اسریٰ کمرے سے نکل کر اسے جھپٹ کر اٹھا لیتی اور اسے کمرے سے باہر نکلنے نہ دیتی۔ میری بیوی کو اس بات سے کافی تکلیف پہنچتی۔ میں ان باتوں کو نظر انداز کرتا رہتا لیکن ایک بار جب غزالہ کو تیز بخار آ گیا تو میں اسے ڈاکٹر کے ہاں لے گیا۔ ڈاکٹر نے دوائیں لکھیں لیکن رات بھر اس کا جسم حرارت سے پھنکتا رہا۔ ہم دونوں رات بھر سو نہیں سکے۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے میں اسریٰ کے کمرے میں چلا جاتا اور سوتا ہوا دیکھ کر واپس چلا آتا۔ ایک بار جب کمرے کی جانب گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ اسریٰ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے۔ میں رات بھر یا تو ڈرائینگ روم میں ٹہلتا رہا یا اپنی بیوی کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھا رہا۔ بیوی نے کئی بار کہا کہ میں بھی سو جاؤں لیکن نیند نہ آتی تھی۔ صبح صبح کے قریب میری آنکھ لگی۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد جب میں نے بچی کے بخار کے

بارے میں پوچھا تو اسریٰ نے بڑی درشتگی سے جواب دیا۔ ''اس کا بخار تو کم ہو گیا ہے لیکن آپ کے آنے جانے سے میری نیند حرام ہو گئی تھی۔'' میں سکتے میں آ گیا۔ میں نے کہا ''ہم تو بچی کے بارے میں پریشان تھے۔ کیا تمہیں اس بات سے تکلیف پہنچی ہے؟'' اسریٰ نے اسی لہجے میں کہا ''اس کے باپ کو تو اس کی فکر ہی نہیں ہے یہ آپ کو پوتی کی فکر کب سے ہونے لگی۔ یہ کہہ کر وہ ہال سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آ کر کہا۔ ''میں ماں کے گھر جا رہی ہوں۔ وہاں بچی کا بہتر علاج ہو گا۔ یہاں تو پہلے ہی سے ایک بیمار موجود ہے۔'' تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میری بیوی سے ملے بغیر دندناتی گھر سے نکل گئی۔ اسی دن عاطف کا فون آیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سب کچھ بتانا پڑا۔ وہ اچانک بے حد غصے میں آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''ماں کی صحت کا خیال رکھنے کے بجائے اس نے غزالہ کے بخار کو بہانہ بناتے ہوئے ماں کے گھر کا راستہ لیا ہے۔ اب اسے آپ وہیں رہنے دیں۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا موڈ بہت خراب ہو گیا۔ اس نے فون رکھ دیا۔ اسریٰ کے اپنے میکے جانے کے ٹھیک پندرہ دنوں بعد میری بیوی کے قلب پر پھر ایک زبردست حملہ ہوا۔ ہسپتال لے جانے تک انھوں نے دم توڑ دیا۔ مجھ پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بیٹے کو اطلاع دی۔ اس نے کہا کہ میں فوراً حیدرآباد آ رہا ہوں۔ آپ میرا انتظار کریں۔'' رشتہ دار جمع ہوئے۔ میت کو گھر لا لیا گیا۔ پھر عاطف کا فون آیا کہ وہ ایمرجنسی فلائٹ سے شام تک پہنچ رہا ہے۔ شام میں اس کے گھر آنے کے بعد آخری سفر کی تیاری شروع کی گئی اور مغرب کے وقت انھیں سپردِ لحد کر دیا گیا۔ اسریٰ اور اس کی ماں کئی گھنٹے بعد ہمارے گھر آئے تھے۔ تدفین کے بعد جب ہم اپنی دنیا لٹا کر گھر میں داخل ہوئے تو اسریٰ کو دیکھتے ہی عاطف نے کہا ''اب کیا کرنے کے لیے آئی ہو؟ بہت خدمت کی تم نے ساس کی۔ جاؤ! اماں کی خدمت کرو۔'' میں نے اور سب رشتہ داروں نے اسریٰ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی ماں نے بڑے جوش سے کہا ''جس گھر میں بہو کی عزت نہیں ہوتی ہے وہاں اس کا رہنا بے کار ہے۔ اس سے پہلے کہ عاطف کچھ کہتا۔ اس کی ماں نے اسریٰ کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل گئی۔

وہ دن اور آج کا دن۔ پھر کبھی اسریٰ نے اس گھر میں قدم نہیں رکھا۔ دس دن کے بعد عاطف نے مجھے فون کیا کہ وہ اسریٰ کو طلاق دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ کسی طرح بھی اس کے ساتھ

رہنے کے لیے تیار نہیں ہے حالانکہ وہ اسے اپنے ہاں بلانے کے لیے تیار تھا۔ میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ آج تک ہمارے خاندان میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن اس نے کہا کہ اسریٰ کی ماں اسے خود سے جدا کرنا ہی نہیں چاہتی ہیں۔ میں نے اس کے بھائیوں سے بھی ربط پیدا کیا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ معاملہ اسریٰ اور اس کی ماں کی مرضی پر منحصر ہے۔ پھر میں نے اسریٰ کی ماں سے بات کرنے کی کوشش کی تو کئی بار کی کوششوں کے بعد فون پر اس نے کہا کہ اب اس گھر میں رہنا اسریٰ کے لیے ناممکن ہے اور وہ شوہر کے ہاں بھی جانا نہیں چاہتی۔ جب میں نے بچی غزالہ کے مستقبل کی بات کی تو اس نے کہہ دیا ''یہ ہماری ذمہ داری ہے۔'' اب کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

تب سے اسریٰ اپنی ماں کے گھر ہی میں ہے۔ عاطف کو گھر آئے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں تنہا اس ڈھنڈار مکان میں رہتا ہوں۔ عبادتوں اور لکھنے پڑھنے میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ دن تو جیسے تیسے نکل جاتا ہے لیکن راتیں کسی اندھے کنویں کی طرح منہ کھولے آتی ہیں۔ غزالہ کا ہیولا سامنے آ جاتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے۔ عاطف کو بچی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملتا رہا تھا لیکن غزالہ مجھ سے اور میری مرحوم بیوی سے بہت مانوس تھی۔ بیوی کے انتقال کے بعد سے غزالہ سے دوری کا احساس اور بھی بڑھ گیا ہے۔ صبح ایک نوکرانی آتی ہے اور دن بھر کے لیے میرا کھانا پکا جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی فون آ جاتا ہے ورنہ میں ایک مسلسل قید تنہائی سے گزر رہا ہوں جس کی معیاد کب ختم ہوگی، یہ بھی نہیں جانتا۔

☆☆☆☆

AAKHRI PODA

(Selected Storeis)

By: Rifat Siddiqi
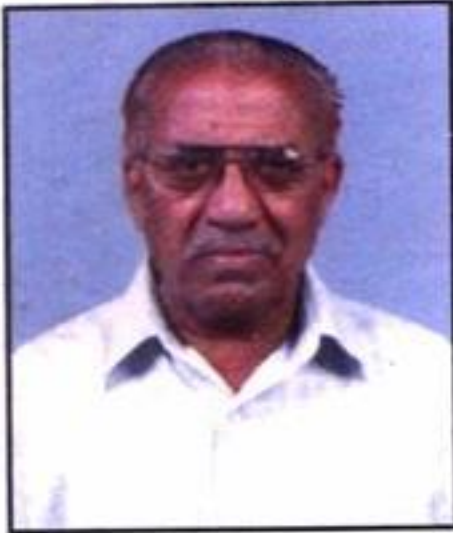
رفعت صدیقی

تاریخ پیدائش: 6-10-1941

قابلیت: بی اے، بی جے

ملازمت

—اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں بحیثیت آفیسر مختلف برانچس میں 32 سال تک خدمات انجام دیں۔

—ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اردو روزنامہ منصف، حیدرآباد میں 2000 سے 2005 تک سیاسی، ثقافتی اور سماجی موضوعات پر مبنی مضامین کا ترجمہ۔

—سال 2005 اردو روزنامہ اعتماد، حیدرآباد میں بحیثیت فیچرز ایڈیٹر اور مترجم برسرکار

—مولانا آزاد یونیورسٹی میں ڈپارٹمنٹ آف جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشنس میں بحیثیت گیسٹ فیکلٹی ممبر کام کیا ہے۔

......ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جرنلزم اور ماس کمیونیکیشنس کی گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کورسس کی نصابی کتب کی تدوین اور ترجمہ انجام دیا اور دونوں یونیورسٹیوں کی syllabus کمیٹیوں میں شامل رہے۔

پتہ: فلیٹ نمبر۔103، بی بلاک، فرسٹ فلور، پریمیز انکلیو، ہمایوں نگر، حیدرآباد۔500028

فون: 040 - 23535175

سیل: 09885697408

(تصانیف)

۱۔ ہیرے کا جگر (منتخب افسانے) 1996

۲۔ اک شجر ہواؤں کی زد پر (شعری مجموعہ) 2007

(زیر طبع تصنیفات و ترجمے)

۱۔ قربتوں کا حساب (مضامین اور خاکے)

(ترجمے)

Hazrat Mohammad
Life and Achievements
By: Prof. Shameem Aleem

(اردو ترجمہ)

Gandhi and his Outstanding
Leadership
By: Allen Pascal Nazareth

(اردو ترجمہ)

اللہ کی عظمت اور قرآن کا نظریہ علم و سائنس

مصنف: عزیز احمد خان ایڈوکیٹ

(انگریزی ترجمہ)

ٹیپو سلطان اور دیگر ڈرامے

از: حسین آغا (اردو ترجمے)

Islam and Secularism
By: Hashim Ali Akhtar IAS

(اردو ترجمہ)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com